

سوانح

حضرت قاری فیض کریم صاحب



مرتبہ

حافظ قاری فیوض الرحمن ایم اے امتیاز می (عربی، اسلامیات، اردو، فارسی)
صدر شعبہ اسلامیات گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد ضلع بہارہ صوبہ سرحد

نام کتاب : سوانح حضرت قاری فضل کریم صاحب

ناشر : مجلس اہلوائے قدیم

درسہ تجوید القرآن ————— کوچہ کنڈی گراں، لاہور

تالیف : حافظ قاری فیوض الرحمن ایم اے

۱۷۸۰۲ تعداد ————— ایک ہزار

قیمت : ایک روپیہ پچاس پیسے

کتابت : نجیب احمد سلیم مسجد مبارک اسلامیہ کالج
ریلوے روڈ لاہور

مطبع : الیٹ، ایچ آرٹ پرنٹرز

۷- چیمبر لین روڈ - لاہور



ان مقدس قرآنی شخصیتوں اور جاں نثاران سرور کو عینِ اصلی اللہ
 علیہ وسلم کے نام جو نبوتِ خاتمہ اور رسالتِ عامہ کے عینی شاہد، عادل
 اور ثقہ ہیں، نقد و جرح سے بالاتر اور معیارِ حق ہیں۔ جو اپنا مال، اپنی اولاد
 جان، زبان اور تلوار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت و نصرت کا
 حق ادا کر کے رضائے الہی کی ڈگری دنیا ہی میں لے چکے ہیں۔ جن کی محبت
 و عقیدت اور پُر خلوص اتباع پوری امت کے لیے باعثِ نجات ہے

اعفة ذکرت فی الوحی عفتہم (سیدنا حسن)
 لا یطیعون ولا یندیہم الطمع

۱۵۹
 ۱۵۹
 ۱۵۹

DATA ENTERED

۲۹۷۶۹۲
ف ۷۲ س

۱۷۸۰۳

فہرست مضامین

صفحہ	لکھنے والے	عنوانات	نمبر شمار
۵	قاری محمد عارف ایم اے	دیباچہ	۱
۲۴	قاری محمد عارف ایم اے	کچھ اس کتاب کے بارے میں	۲
۳۲	بین ام کلثوم دختر حضرت قاری صاحب	حضرت قاری صاحب کے مختصر حالات	۳
۵۹	قاری انصالحق صاحب	حضرت قاری صاحب	۴
۶۷	حافظ قاری عبدالمجید صاحب	یا استاذی	۵
۷۱	جناب احمد خالد عمر صاحب ایم اے	حافظ قاری فضل کریم صاحب	۶
۷۵	قاری محمد اقبال صاحب	یاد استاذ المکرم	۷
۷۹	حافظ قاری فیوض الرحمن ایم اے	حضرت قاری صاحب کے بارے میں چند تاثرات	۸
۸۹	حضرت مولانا قاری الطہار احمد صاحب تھانوی	آہ قاری فضل کریم صاحب	۹
۹۷	حضرت مولانا قاری محمد شریف صاحب	یاد اکابر	۱۰
۱۰۴		قاری صاحب کے چند تراجم	۱۱

دنیائے چہ

الحمد لله الذي اعزنا بكتاب العظيم والصلوة و
والسلام على خاتم الانبياء والمرسلين وعلى اله
واصحابه واتباعه الذين بلغونا الكتاب المبين و
على الذين يحفظونه الى يوم الدين

زیر نظر کتاب حضرت قاری فضل کریم صاحب کے حالات زندگی اور
خدمات قرآنیہ سے متعلق، اکابر و احباب کے چند مضامین کا مجموعہ ہے اس کتاب
کا ویساچہ لکھنے کے لیے براہِ محترم قاری فیوض الرحمن نے مجھ سے تاکیداً فرمائش کی،
میں اس لیے متامل رہا کہ نہ حافظ ہوں، نہ عالم نہ قاری، لیکن عزیزِ مکرّم نے سچھا
نہ چھوڑا اور آخر کار اس سعادت میں میرے جیسے نالائق کو بھی شریک کر لیا۔
اس ویساچہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حفاظ، قراء اور علماء کی عزت قرآن مجید
ہی کی عظمت کی وجہ سے ہے اور وہ سچہ جو معذور اور کس پرسی کے عالم ہیں تھا،
اس کی شخصیت قرآن کی بدولت ایسی مشہور ہوئی کہ طلباء اور قراء بڑے قاری
صاحب کہہ کر پکارنے لگے۔ ہم عظمت قرآن لکھنے کے بعد، قاری صاحب کی
شخصیت کے بارے میں بھی کچھ وضاحت کریں گے۔ اور یہ بھی ثابت کریں گے
کہ آپ کو قرآن مجید نے ہی بڑا بنایا۔

عظمت قرآن

در اصل یہ قرآن مجید، اللہ تعالیٰ کا عزت والا کلام ہے۔ حق تعالیٰ نے جبریل امین کے ذریعے اسے، رسول امین صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا۔ اس کے مخاطبین اولین عرب تھے۔ نزول قرآن سے پہلے ان لوگوں میں تقریباً تمام جرائم موجود تھے۔ شراب پیتے، ڈاکے ڈالتے، جوا کھیلتے اور آپس میں ایک دوسرے کو معمولی معمولی باتوں پر قتل کرتے، بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے اور بتوں کی پرستش کرتے تھے۔

یہ لوگ علم و حکمت سے عاری تھے۔ تہذیب و تمدن سے نا آشنا تھے۔ جہانگیرمی اور جہانبنانی کے طریقوں سے بالکل بے خبر تھے، بلکہ وہ ایسے تھے، جنہیں اس وقت کی تمدن حکومتیں اپنی رعایا بنانا بھی پسند نہ کرتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان ہی لوگوں میں، اپنے آخری پیغمبر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ پر اپنا عزیز کلام اتارا۔ جو لوگ اس کلام پر ایمان لائے وہ اعلیٰ درجہ کے شائستہ، مہذب اور تمدن بن گئے، جن کے ہاتھوں عزت و آبرو برباد ہوتی تھی، وہ عزتوں اور آبروؤں کے محافظ بن گئے۔ رہنما رہے، جو ان پڑھ تھے انہوں نے علوم کے ذریعہ تیار کر دیے اور اسی کتاب کی بدولت صحرا نوروں کے دماغ منور اور روشن ہوئے۔

رہنماں اور حفظ اور مہذب شدند

از کتاب صاحب و فتنہ شدند

دشت پیمایاں ز تاب یک چرخ

صد تجلی از علوم اندر دماغ

ان کا تزکیہ ہوا۔ انہوں نے دائمی امن و سلامتی کا قرآنی پیغام دوسری قوموں تک پہنچایا۔ جس نے تسلیم کیا، معزز ہوا اور جس نے مقابلہ کیا، ذلیل ہوا۔ رومی شہنشاہوں اور کیانی فرماؤں کی باطل طاقتوں نے اس پیغام الہی کو روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ مگر ناکام رہیں۔ ان حاملین قرآن نے بل قوتوں کو پاش پاش کر دیا۔ دشت ان کے تابع ہوئے۔ دریاؤں نے ان کے لیے راستے صاف کر دیے۔

دشت تو دشت دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے

بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

قاوسیہ کے میدان میں ایرانی عظمت ختم ہوئی۔ وہ محلات، باغات، چشمے، کھیت اور صحبت افزا مقامات جن میں خدا کے باغی رنگ ریاں منیا کرتے تھے چھوڑ کر جاگ گئے اور تابعین قرآن ان کے وارث بنے۔

كَمْ تَوَكُّوْا مِنْ جَنَّتٍ وَّ عِيُوْنٍ ۝ وَّ نَارٍ وَّ نَارٍ ۝ وَ مَقَامٍ

كَبِيْرٍ ۝ وَ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ ۝

اَوْ مَا تُنْبِئُهَا قَوْمًا اٰخِرِيْنَ ۝ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ

وَ الْاَرْضُ ۝ وَ مَا كَانُوْا اَسْمٰطِيْنَ ۝ (سورہ دخان)

ایرانیوں کی شکست قاش پر، ایران محلات میں داخل ہوتے ہوئے، فاتح ایران سیدنا حضرت سعد بن وقاصؓ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور

زبان پر بے ساختہ یہی مذکورہ بالا آیات جاری ہو گئیں۔

اسی طرح یرموک کے کنارے رومی سطوت و جبروت بھی تباہ و برباد ہو گئی اور بالآخر مسلمان قیصر و کسریے کے تخت کے مالک بن گئے۔ جس طرف بھی مسلمانوں نے رخ کیا، کامیاب ہوئے اور دنیا کی کوئی بھی طاقت اسلام کے سیلاب کو نہ روک سکی نہ

مغرب کی وادیوں میں گونجی اداں ہماری

مہمتا نہ تھا کسی سے سیل رواں ہمارا

یہ تمام فتوحات قرآن مجید کی بدولت تھیں۔ جب تک مسلمان اجتماعی طور پر، قرآن کو مضبوطی سے پکڑے رہے کامیابیاں ان کے قدم چومتی رہیں۔ بڑی غالب ہے یہ کتاب اور نہایت عزت والی ہے۔ سچ فرمایا اللہ تعالیٰ نے وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝

قرآن کتابِ عزیز ہے

بلاشک و شبہ قرآن عزت والا ہے۔ علماء نے عزیز کے دو معنی کچھ ہیں۔ زبردست اور عزت والا۔ یہ قرآن زبردست بھی ہے اور عزت والا بھی ہے۔ اس کے غلبہ، زور اور طاقت کا یہ عالم ہے کہ عرب کے فصحاء و بلغاء بلکہ تمام مخلوق کو، مقابلہ کے لیے چیلنج دے رہا ہے۔ قرآن کا مثل لاؤ۔ وہس سورتیں ہی نہ لو۔ اس جیسی ایک سورہ ہی لے آؤ۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا۔

قُلْ لِّئِنْ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ يَّاتُوْا بِمِثْلِ

هَذَا الْقُرْآنَ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ عَلَى
بَعْضٍ ظَهِيرًا ○ (سورہ بنی اسرائیل)

ایک اور مقام پر وہ سورتیں پیش کرنے کی شجہ کی
أَمْ يَقُولُونَ افْتَدَاهُ قُلُوبُنَا لَوْ آتَوْنَا بِعَشْرٍ سُوْرٍ مِّثْلِهِ
مَفْتَنَاتٍ وَإِدْعَاؤِ مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ
كُنْتُمْ صَادِقِينَ ○ (سورہ لہود)

ایک جگہ صرف ایک سورت کے مقابلہ کے لیے بلایا۔
قُلُوبُنَا لَوْ آتَوْنَا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ مَا ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ مِنْ
دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ مُرْسِلِينَ ○ (سورہ بقرہ)
کتاب کی قوت کا اندازہ لگائیے کہ عربوں کو (جو اپنے سوا پوری دنیا کے
انسانوں کو گونگا سمجھتے تھے) مقابلہ کی دعوت دی جا رہی ہے کہ تمام انسانوں
جنوں اور اپنے معبودانِ باطلہ کو جمع کر کے لائیں اور ساتھ ہی قیامت تک
منکرین کی شکستِ فاش کی پیش گوئی بھی فرمادی ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ عربوں نے اپنے مالِ قرآن کے مقابلہ میں خرچ کیے،
اپنے بیٹے میدانِ جنگ میں کٹوائے اور خود بھی مسلمانوں کی تلواروں کے سامنے
آکھڑے ہوئے، مگر اتنا نہ کر سکے کہ تروید میں إِنَّا اعْطَيْنَاكَ الْكِتَابَ
کی مانند ایک سورہ ہی بنا لاتے۔

ان کے بعد ہر دور میں عربی زبان کے ماہر اور فاضل غیر مسلم پیدا ہوتے
رہے۔ بڑے بڑے شاعر پیدا ہوئے۔ اشعار کے دیوان مرتب کیے۔ بڑے

کامل اویب اور ماہرین لغت آئے۔ جنہوں نے عربی لغت پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھیں لیکن قرآن کا مقابلہ نہ کر سکے۔

اس ایٹمی اور سائنسی دور میں بھی جب کہ سائنس دان تشکیوں، دریاؤں، فضاؤں اور خلاؤں کو فتح کر کے چاند کی دنیا میں قدم رکھ چکے ہیں۔ قرآن کی ایک چھوٹی سے چھوٹی سورت لانے سے اب بھی عاجز ہیں۔ دنیا کی کسی کتاب نے، آج تک ایسا چیلنج نہیں دیا جیسا کہ قرآن نے دیا ہے۔ پس یہ بڑی زبردست اور غالب کتاب ہے۔

عزیزوں کے دوسرے معنی "عزت والا" ہیں۔ قرآن مجید سے، دنیا اور آخرت کی عزت ملتی ہے۔ جو بھی شخص ایمان و یقین کے ساتھ قرآن کے قریب آئے گا، عزیز ہو جائے گا۔ اگر مسلمان کا، اس کتاب عزیز پر مجموعی طور پر عمل ہوگا تو خلافت ارضی بھی نصیب ہوگی جیسا کہ ہم پہلے صحابہ کرام کے بارے میں لکھ چکے ہیں، اور اخروی سعادتیں بھی حاصل ہوں گی۔ اگر انفرادی عمل ہو تو پھر بھی فائدہ سے خالی نہیں۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ معمولی آدمی جب قرآن مجید کے معانی سمجھنے لگتا ہے تو لوگ اسے مولوی صاحب اور مولانا صاحب کہتے ہیں اور جو شخص قرآن کو یاد کر لیتا ہے تو لوگوں میں حافظ جی مشہور ہو جاتا ہے اور جو قرآن و تجوید سے پڑھ لیتا ہے تو قاری صاحب بن جاتا ہے۔ یہ ساری عزتیں قرآن کی وجہ سے ہیں۔ اگر قرآن مجید کا واسطہ درمیان سے ہٹا دیا جائے تو نہ کوئی مولوی ہے، نہ مولانا، نہ حافظ جی، نہ قاری صاحب۔ واقعی بلاشبک و شبہ یہ عزت والی کتاب ہے۔

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ قرآن مجید کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

برخورد از قرآن اگر خواہی ثبات
در ضمیرش دیدہ ام آب حیات
مے و ہد مارا پیام لاسخف
مے رساند بر مقام لاسخف
نقش قرآن تا درین عالم نشست
نقش ہائے کاہن و پاپا شکست
فانش گویم آنچه در دل منمست
این کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بسجاں در رفت جہاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

کس قدر زور اور تاکید سے علامہ فرماتے ہیں:-

تو ہی دانی کہ آئین تو چیست؟
زیر گردوں سر تمکین تو چیست
آں کتاب زندہ قرآن حکیم
حکمت اولایزال است و قدیم
مثل حق پنهان و ہم پیدا این
زندہ و پائندہ و گویا است این
نوع انساں را پیام آخرین
حامل اور رحمت للعالمین سے
رہنرناں از حفظ اور مہر شدند
از کتابے صاحب دفتر شدند

و نشت پیامیاں ز کتاب یک چراغ

ضد تجلی از علوم اندر و مانع،

ہم مسلمان جو اس وقت مصائب و آفات کا ہدف بنے ہوئے ہیں اور
حقیقی کامیابی کے دروازے ہمارے لیے بند ہو چکے ہیں اور ہم اس قدر کمزور
ہو چکے ہیں کہ بعض توہین ہمیں لقمہ تر خیال کرتے ہوئے نکلنے کی کوشش میں
لگی ہوئی ہیں، تو علامہ کہتے ہیں کہ ہماری اس ذلت اور خواری کی وجہ ترک
قرآن ہے۔

سہ خوار از مجبور ہی قرآن شدی شکوہ سنج گردش دوران شدی

اے پو شبنم بر زمین افتندہ در غسل داری کتاب زندہ

تا کجا در خاک مے گیسری وطن رخت بردار و سرگردوں فلکن

اسی کتاب مجید پر عمل کر کے صحابہ معزز اور کامیاب ہوئے اور اس کو

چھوڑ کر بعد میں آنے والے ذلیل اور ناکام ہوئے۔

ان الله يرفع بهذا الكتاب اقواما و يضع به اخدين

علامہ فرماتے ہیں کہ :-

اُس کتاب پر عمل کر کے تم اپنی کمزوریاں دور کر سکتے ہو اور

اپنے تمام مقاصد میں کامیاب ہو سکتے ہو۔

سہ نسخہ اسرار تکوین حیات بے ثبات از قوتش گیر حیات

از تلاوت بر توحی دار و کتاب تواز و کامی کہ می خواہی بیاب

علامہ کا ایمان ہے کہ بغیر قرآن کے مسلمان کی کوئی زندگی نہیں ہے۔ فرماتے ہیں

کہ اگر تم مسلمان ہو کر زندہ رہنا چاہتے ہو تو قرآن کے بغیر چارہ کار نہیں۔

گر تومی خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بقراں زیستن

پس ہماری بادشاہت، عزت، حفاظت، بقا، دوام و ثبات اور

زندگی کا دار و مدار اسی کتاب عزیز پر ہے۔

علامہ شاطبی علیہ الرحمۃ نے کتاب کے مقدمہ ہی میں چند نہایت مؤثر

اشعار فضائل قرآن پر لکھے ہیں۔ ترغیب قرآن پر بہت عمدہ شعر ہیں۔ ہم انہیں

اپنی سعادت اور قارئین کرام کے فائدے کے لیے یہاں نقل کرتے ہیں۔

حمد و صلوة کے بعد علامہ شاطبی فرماتے ہیں۔

وَلْيَعِدُّ فَحَبْلُ اللَّهِ فِينَا كِتَابُهُ ① فَبَاهِدِ بِحَبْلِ الْعِدَا مُتَحَبِّلًا

۱۔ ہمارے لیے خدا کی رسی اس کی کتاب ہے۔ لہذا اے قاری قرآن! اس

کتاب کے دلائل و براہین کے ساتھ دشمنوں کے سر و فریب کی تار و پود

بکھیر دے۔ قرآنی دلائل و آیات کے ذریعہ ایسا جال تیار کر کہ جس سے تو

شکار کر کے دشمنوں کو حق کی طرف لے آئے۔

وَ أَخْلِقْ بِهَا إِذْ لَيْسَ يَخْلُقُ جِدَّةً ② جَدِيدًا أَمْوَالِيهِ عَلَى الْجِدِّ مُقْبِلًا

۲۔ یعنی قرآن میں جد و جہد کرنا کس قدر لائق تحسین ہے کیونکہ اس کی جد

کبھی بھی بوسیدہ نہیں ہوتی۔ قرآن سے لگاؤ رکھنے والے حق کے پیکر

بن کر اس کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔

وَ قَابِلًا لَهُ الْمَنْعَى قَسَّ مِثَالَهُ ③ كَالْأُتْرُجِ حَالِيهِ مِنْ يُحَاوِرُوكِلًا

۳۔ یعنی قرآن کا پڑھنے والا مستحسن زندگی کا مالک ہے۔ اس کی قرارت کے

عمل کی وجہ سے حدیث میں اس کو ترنج سے مشابہ کیا گیا ہے جس میں

دوہری خوبیاں ہوتی ہیں۔ خوشبودار اور کھانے میں لذیذ۔

هُوَ الْمَنْتَضَى أَمَّا إِذَا كَانَ أُمَّةً ④ وَيَمَّةً ظَلَّ النَّانَةَ قُنْفَلًا

۴۔ یعنی قاری قرآن جبکہ لوگوں کے لیے پیشوا ثابت ہو تو اپنے مقاصد کے

لحاظ سے وہ پسندیدہ الٰہی ہوتا ہے۔ سکینت و وقار، تاج کسرے بن کر

اس کا ارادہ کرتی ہے۔ کیوں کہ فضائل خیر اس میں بکثرت موجود

ہوتے ہیں۔

هُوَ الْخُدْرَانُ كَانَ الْعَرَبِيُّ حَوَارِيًّا ⑤ لَهُ تَبَعٌ يَهْدِيهِ إِلَى أَنْ تَنْبُرَ

۵۔ یعنی قاری آزاد ہوتا ہے۔ دنیا کی خواہش اسے غلام نہیں بنا سکتی۔
بشرطیکہ وہ اس کا اہل بھی ہو اور حالت یہ ہے کہ وہ قرآن کا حواری (مددگار)
اور اس کی خدمت کرنے میں مرتے دم تک شایانِ شان جدوجہد سے
کامل ہے۔

وَإِنَّ كِتَابَ اللَّهِ أَوْثَقُ شَرَفِ ④ وَاعْتَنَى غِنَاهُ وَاهْبَاءُ مَفْضَلِ

۴۔ یعنی اللہ کی کتاب اپنے حامل کے لیے بہترین و قابلِ اعتماد سفارش
کرنے والی ہے۔ یعنی اس کتاب پاک کی حالت یہ ہے کہ بقدر کفایت بلکہ
مزید فضل کا سامان ثابت ہوتی ہے۔

وَخَيْرٌ جَلِيسٍ لَا يَمَلُّ حَدِيثُهُ ⑥ وَتَدَادُ أَدَاؤُهُ دَا دُفِيهِ تَجَمُّدًا

۶۔ یعنی کتاب اللہ بہترین ساتھی اور بہترین انیس ہے۔ اس کی ہم نشینی
سے کبھی آدمی تنگ دل نہیں ہو جاتا، نہ اس کے مکالموں سے طبیعت
اکٹاتی ہے اور اس کا بار بار ورد، اس کے جمال و حسن کے اضافہ کا
باعث ہوتا ہے۔

وَحَيْثُ أَلَمَ نَيْتَاعٌ فِي ظُلْمَاتِهِ ⑧ مِنْ الْقَبْرِ يَلْقَاهُ سَنَا مَهْلِكًا

۸۔ یعنی اگر قاری، قبر میں، اپنی ظلمتوں اور گناہوں سے گھرا ہوا ہو تو
یہ قرآن مجید اس کے لیے روشنی کا سامان بن کر روشن ہوتا ہوا ملے
گا۔

هُنَالِكَ يَهْنِيهِ مَقِيلًا وَرَافِعَةً ⑨ وَمِنْ أَحْبَلِهِ فِي ذُنُودِ الْعَرِيِّ يَجْمَلًا

۹۔ یعنی اس وقت قرآن پاک قاری کو مبارک باد دے گا اور اس کی قبر کے آرامگاہ ہو جانے اور پر عیش باغ میں تبدیل ہو جانے پر مسرت کا پیغام ثابت ہو گا۔ اور قرآن کی تلاوت کی وجہ سے، قیامت کے دن قاری عزت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہو گا۔

يُنَاسِدُ فِي إِمْرَاتِهِ لِحَبِيبِهِ ⑩ وَأَجِدُ مَا بِهِ سُؤْلًا إِلَيْهِ مَوْصِلًا
۱۰۔ یعنی قرآن مجید، اپنے دوست (قاری) کو راضی رکھنے میں اپنی پوری قوت صرف کرے گا (اس وقت) قاری کو منزل مقصود پر پہنچانے میں یہ قرآن کس قدر قابل تدر ثابت ہو گا۔

فِي أَيِّهَا الْقَارِي بِهِ مُتَمَسِّكًا ⑪ مُجِلَّةً لَهُ فِي كُلِّ حَالٍ مُبِجِّلَةً
۱۱۔ اسے قرآن کے پڑھنے والے ان حالات میں کہ تو اس قرآن کو مضبوط مقامے، ہر حال میں اس کی عزت کرنے اور عظمت پیش نظر رکھنے والا ہے۔

هَيْئًا مَبِيحًا وَالذَّائِقَ عَلَيْهَا ⑫ مَلَا بِسُ أُنْعَامٍ مِنَ التَّلَاجِ وَالْحُلَّةِ
۱۲۔ یعنی قرآن تیرے والدین کے لیے مبارک اور خوش عیشی کا پیام ثابت ہو کہ ان کو تاج اور زیورات سے آراستہ نورانی لباس پہنائے جائیں گے۔

فَمَا ظَنُّكُمْ بِالنَّجْلِ عِنْدَ جَزَائِهِ ⑬ أَوْلِيكَ أَهْلُ اللَّهِ وَالصَّفْوَةُ الْمَلَّةِ
۱۳۔ یعنی ایسی صورت میں تمہارا کیا خیال ہے خود اس برخوردار کے متعلق جبکہ وہ جزا و انعام پارہا ہو گا۔ یقیناً یہی لوگ اہل اللہ اور باعزت مقرر ہیں۔
ارگاہ الہی ہوں گے۔

أُولُو الْيُبِّ وَالْأَحْسَانِ وَالْقِي ⑭ حُلَّةٌ لَهُمْ بِهَاجَاءِ الْقُرْآنِ مُفَضَّلَةٌ

۱۴۔ یعنی حاملینِ قرآن نیکی اور اخلاص کے پیکر ہوتے ہیں۔ صبر اور تقویٰ ان کے اوصاف ہوتے ہیں۔ قرآن نے مفصل طور پر یہ اوصاف پیش کیے ہیں۔

عَلَيْكَ بِهَا مَا عَشْتِ فِيهَا مَبِئْسًا ﴿١٥﴾ وَبِئْسَ نَفْسُ الْدُّنْيَا بَانْفِاسٍ بِالْعُلَا

۱۵۔ یعنی جب تک تو زندہ ہے حاملینِ قرآن کے ان اوصاف کی طرف کی طرف سبقت کرنے کی کوشش کر اور اپنے نفسِ حقیر کو ان اوصاف کی طرف سے عیب کے عوض تبدیل کرے۔

پس قرآن مجید کتابِ محفوظ اور کتابِ عزیز ہے۔

حق تعالیٰ حفاظ و قرار اور علماء کو دنیا میں پاکیزہ اور باعزت زندگی نصیب فرماتے ہیں اور آخرت میں اجرِ عظیم سے نوازیں گے۔ بڑے بڑے جبار و قہار اور فاتح بادشاہ دنیا میں آئے اور چل دیے۔ اب وہ زمین کے پیٹ میں ہیں اور کوئی بھی ان کا پرسانِ حال نہیں، کہیں ان کا ذکر خیر نہیں۔ اور کہیں صدقہ جاریہ نہیں اور ایسے خدامِ قرآن بھی ہیں جن کے صدقاتِ شب و روز جاری ہیں ایسے بھی ہیں جن کے دہن دنیا ہی میں خوشبو سے مہکتے رہے ہیں اور جن کی قبریں

۱۔ یہ ترجمہ حضرت مولانا قاری اطہار احمد صاحب تھانوی دامتہ برکاتہم کی شرح شاطبیہ

سے نقل کیا گیا ہے۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء

۲۔ حضرت نافع مدنی رجبِ قرآن پڑھانے بیٹھتے تو منہ سے خوشبو آتی تھی۔ آپ سے پوچھا

کیا کیا آپ جب بھی پڑھانے بیٹھتے ہیں تو خوشبو استعمال فرماتے ہیں؟ آپ نے جواب

(بقیہ برص)

بھی بقعہ نور بنی ہوتی ہیں لے

دنیا میں کسی بھی چیز کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے ذمہ نہیں لیا سوائے قرآن
کریم کے۔ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحفظون ● دنیا میں کفر و شرک
نما و زندگی کے خواہ کتنے ہی سیلاب، آندھیاں اور طوفان کیوں نہ آجائیں۔ اس
دور کو ہرگز کبھی بھی سمجھا سکیں گے نہ

تَاخِذُوا نَفْسَكُمْ بِرَبِّكُمْ
اِنَّكُمْ لَعِنَآ اِنْ كُنْتُمْ
مُشْرِكِیْنَ

بقیہ حاشیہ ص ۱۷ دیا۔ میں نے خوشبو کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ
غائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے منہ میں تلاوت فرما رہے ہیں۔ اس وقت سے
یہ خوشبو آرہی ہے۔ امام شاطبیؒ ان ہی کے بارے میں فرماتے ہیں :-

و اما الکرم السیر فی الطیب نافع فذالک الذی اختارہ المدینۃ من ذلک
لہ علماء فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ کے مزار مبارک کی مٹی سے خوشبو آتی تھی اور لوگ مٹی اٹھا
کر لے جاتے تھے۔ ہم نے اپنے زمانے میں دیکھا کہ استاد الکریم شیخ التفسیر مولانا
احمد علی صاحب لاہوریؒ کی قبر سے خوشبو آتی تھی۔ بے شمار عوام اور متعدد علماء اس پر
گواہ ہیں۔ ہم نے خود اسی معطر مٹی کو اٹھایا ہے اور عجیب و غریب قسم کی خوشبو محسوس
کی ہے۔ یہ خوشبو دراصل کتاب عزیز کی تھی جس کا درس آپ برسن با برس سے جامعہ
مسجد شیرانوالہ میں دیتے رہے۔ حق تعالیٰ اپنے تمام اولیاء پر کر وڑ بار رحمتیں نازل فرمائے
اور ہمیں بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ

وَلِنُورِهِ الْكَافِرُونَ ○

پس جو انسان اس قرآن عزیز سے تعلق قائم کر لیں گے، وہ یقیناً معزز ہوں گے اور چونکہ قرآن مجید محفوظ ہے۔ لہذا ان کی بھی اسی کتاب کی وجہ سے دنیا اور آخرت میں خصوصی حفاظت ہوگی۔

الغرض قرآن مجید وہ کتاب عزیز ہے جو دنیا کو سنوارتی اور عذاب قبر سے محفوظ رکھتی ہے۔ یہ کتاب عالم عرش کے مصائب سے بچانے والی، پل صراط کی تاریکی، تیزمی اور تنگی کو ختم کرنے والی، عذاب جہنم کو ہٹانے والی، جنت میں پہنچانے والی، نعم جنت سے سرفراز کرنے والی اور دیدار حق تعالیٰ سے مشرف کرنے والی ہے۔

گزشتہ چند صفحات میں ہم نے عظمت قرآن بیان کی ہے۔ اب ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت قاری صاحب کو بڑائی کن خدمات کے صلے میں نصیب ہوئی؟

فضل کریم کیسے بڑی شخصیت بن گئے؟

قاری صاحب کو بڑائی قرآن ہی کی بدولت نصیب ہوئی۔ خدمات قرآنیہ سے پہلے آپ کس مہر سی کی حالت میں تھے بچپن ہی میں والدہ ماجدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ماں سو تیلی تھیں۔ چھپک کی بیماری سے تڑپتے تھے۔ مکھیاں پریشان کرتی تھیں۔ اسی مرضی میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔

آپ کو بھائیوں کی طرف سے بھی کوئی امداد مل سکی، بلکہ بھائیوں نے پوری جائیداد پر قبضہ کر کے آپ کو بالکل محروم کر دیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو قرآن مجید کی دولت سے نوازا تو گھر والوں سے کہا کرتے تھے کہ بھائی عبدالعزیز نے اگر کچھ نہیں دیا تو کوئی بات نہیں، عزیز نے تو سب کچھ دے دیا ہے۔ یہ قرآنی خدمات کا صلہ تھا کہ عزیز نے بہت کچھ نصیب فرمایا۔

حضرت مولانا قاری اظہار احمد صاحب تھانوی لکھتے ہیں :-
 ”وہ قرآن کے خادم تھے۔ قوم کے بچوں کو حافظ قاری بنانے کے لیے دل میں بے انتہا تڑپ رکھتے تھے۔ حفظ قرآن کی دولت سے انہوں نے سینکڑوں بچوں کے سینوں کو منور کر دیا۔“
 جناب احمد خالد عمر صاحب آپ کے متعلق لکھتے ہیں :-

”لیکن حافظ جی کی سب سے بڑی خوبی جس نے مجھے متاثر کیا وہ ان کا طرزِ تریلِ قرآن تھا۔ ثواب بیان کرنے والی آیتوں کے موقع پر انبساطِ ظاہر ہوتا تھا اور عذاب بیان کرنے والی آیتوں کے وقت گہرا ہٹ ظاہر ہوتی تھی۔ احکام بیان کرنے والی آیتیں زور اور تاکید کے ساتھ ادا ہوتی تھیں۔“

راقم الحروف رات کے وقت ایک دفعہ باہر نکلا۔ یہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ لاہور شہر قرآنی آیات کی تلاوت سے گونج رہا تھا۔ میں نے سکی مسجد انارکلی کا رخ کیا۔ جوں جوں قریب ہوتا گیا۔ لطف زیادہ محسوس ہونے لگا۔ قاری صاحب پڑھ رہے تھے۔ ان کی قرأت میں زبردست

روانی اور مد و جزر تھا۔ قاری صاحب پڑھتے پڑھتے جب کم تک کوا من جنت
 و عیون ○ و ناد و ع و مقام کونیم ○ و نعمة کائوا فیہا فکہین ○
 پر پہنچے تو آواز اس انداز سے بلند کی کہ میں مسحور ہو گیا اور یوں سمجھنے لگا کہ یہ آیات
 ابھی نازل ہو رہی ہیں۔

قاری عبد المجید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

و کان جمیل الصوت ، لیسحر الا نسان من صوتہ
 كلما یدتل القرآن

یعنی آپ جمیل الصوت تھے جب آپ ترتیل سے پڑھتے
 تو سامعین مسحور ہو جاتے۔

مولانا قاری اطہار احمد صاحب فرماتے ہیں:

”قاری صاحب بہت عمدہ قرآن پڑھتے تھے تلاوت میں
 مد و جزر کی کیفیت ہوتی۔ سننے والے یہی خیال کرتے کہ کوئی جوان
 پڑھ رہا ہے۔ اس عمر میں اور پھر آواز میں یہ بلندی اور کشش،
 ماشاء اللہ!

ع۔ یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے۔“

جناب حافظ محمد صاحب فرماتے ہیں:

ایک دفعہ شبینہ میں قاری صاحب میرا تیسواں پارہ سن
 رہے تھے جب میں نے یہ آیات پڑھیں و اما من اوتی
 کتابہ بشمالہ فیقول یلیننی ثم اوت کتابہ ○ و

لَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِيَّةٌ ۝ تو قاری صاحب پر ایسی رقت طاری
ہوتی کہ عیش کھا کر گر پڑے۔

ان اقتباسات سے قارئین کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ حضرت قاری صاحب کو،
قرآن مجید سے کس قدر تعلق تھا، اور آپ میں خدمت قرآن کا کس قدر جذبہ موجود
تھا بس انہی خدمات قرآنیہ نے آپ کو بڑے قاری صاحب بنا دیا تھا۔ آپ
حفاظ و قرار پر جب خصوصی انعامات الہیہ دیکھتے تو یہی فرماتے۔ یہ قرآن کریم کا صدقہ
ہے۔

جناب قاری فیوض الرحمن صاحب فرماتے ہیں :-
"قاری صاحب کی علالت کے دوران دو تین مرتبہ حاضری
کا موقع ملا بڑی شفقت فرمائی۔ گھر یوں حالات اور تعلیمی کوائف
پوچھے، خوشی کا اظہار فرمایا۔ دعائیں دیں۔ میں نے عرض کیا حضرت
یہ سب کچھ آپ کے جوتوں کا صدقہ ہے۔ فرمانے لگے "نہیں"۔ بلکہ
قرآن کریم کا صدقہ ہے۔"

واقعی رب عزیز نے قرآن عزیز کے صدقے، آپ کو بہت کچھ نصیب فرمایا
تھا اور اس کا آپ اقرار بھی فرماتے تھے اور طلباء کے ذہن میں بھی یہی بات
بٹھاتے تھے۔ حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ اس حقیقت کو یوں بیان فرماتے
ہیں :-

صبح خیزی و سلامت طلبی چوں حافظ
ہر چہ کر دم ہمہ از دولت قرآن کریم

یعنی صبح کے وقت اٹھنا اور سلا متی طلب کرنا عرض جو نعمتیں
نصیب ہوئیں اور جو روحانی مدارج حاصل ہوئے، سب قرآن
عزیز کی بدولت حاصل ہوئے ہیں۔

حضرت مولانا قاری محمد شریف صاحب فرماتے ہیں:

”جب آپ کا جنازہ زیارت کے لیے مکان سے باہر رکھا گیا تو
دیکھنے والوں کا تاثر عجیب تھا۔ چنانچہ میں نے بعض لوگوں کو یہاں تک
کہتے سنا کہ خدمت قبول ہو گئی اور دیکھنے والوں کی شہادت کے بموجب
یوں محسوس ہو رہا تھا گویا آپ مسکرا رہے ہیں اور چہرے پر اطمینان
کا مینابی کے آثار نمایاں ہیں۔“

اللہ والوں کی یہی کیفیت ہوتی ہے کہ خوشی سے دنیا کے قید خانہ کو چھوڑتے
ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا سعادت ہو سکتی ہے کہ رب عزیز سے بندے کو
وصال نصیب ہو!

حافظ شیرازی فرماتے ہیں

مخرم آن روز کزین منزل ویراں بروم

راحتت جاں ظلم وز پیے جاناں بروم

نذر کردم کہ گرا میں غم بس آید روزے

تا اور سیکدہ شاداں و عزول خواں بروم

واقعی اللہ والے مسکراتے ہوئے بازگاہ الہی میں حاضر ہوتے ہیں۔

مولانا قاری اطہار احمد صاحب فرماتے ہیں:

وفات کے بعد مرحوم کے چہرہ پر کیسی شگفتگی تھی! تبسم کی دلاویز
تصویر بنے ہوئے تھے۔ یہ شگفتگی میں نے عمر میں دو بزرگوں کے چہروں
پر دیکھی، ایک حکیم الامت حضرت تھانویؒ (جو حضرت قاری صاحب
کے بھی پیر تھے) کے چہرے پر اور ایک حضرت قاری صاحب پر،
بقول اقبالؒ:

نشانِ مزدِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

علماء کا ارشاد ہے کہ:

”اے انسان! جب تم دنیا میں آئے تھے تو زور ہے تھے اور
دوسرے لوگ تمہاری آمد پر خوشیاں منا رہے تھے۔ تمہارا کمال یہ ہے
کہ جب تم دنیا سے رخصت ہونے لگو تو اس حالت میں جاؤ، کہ
دوسرے لوگ رورہے ہوں اور تم مسکرا رہے ہو۔“

اسی ارشاد کو ایک عربی شاعر نے بڑے پیارے انداز میں نظم کیا ہے:

وَلَدَتْكَ أُمَّكَ يَا بَنَ آدَمَ بَالِيًّا
وَالنَّاسُ حَوْلَكَ يَضْحَكُونَ سُرُورًا
فَاعْمَلْ لِنَفْسِكَ أَنْ تَكُونَ إِذَا بَلَغَا
فِي يَوْمِ مَوْتِكَ مَسْحُوكًا مَسْرُورًا

مولانا قاری محمد شریف صاحب آخر میں اسی منظر کو یوں بیان فرماتے ہیں:

”نہ معلوم اس وقت کتنوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا ہوگا

کاش یہ جنازہ میرا ہوتا۔ الغرض قرآن کا یہ سچا خادم اس دنیا سے
 کامیاب و کامران کیا اور فضلِ کریم پر، کریم کا فضل ہو گیا۔

یہ ہیں قاری صاحب کے لمحاتِ زندگی جو قرآنی خدمات کے لیے وقف ہو سکے
 اللہ تعالیٰ نے دنیا میں عظمت و عزت سے اور دنیا سے جاتے وقت محمود موت نے
 نوازا خوش قسمت ہیں وہ افراد جو قرآن پڑھتے ہیں، اس پر عمل کرتے ہیں، پھر اسے
 امت مسلمہ کے دوسرے افراد تک پہنچا کر خود محفوظ، عزیز اور لازوال بن جاتے ہیں۔

ہرگز نیر و آنکہ و لیش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریہ عالم دوام ما

حفاظ، قراء اور علماء کا وہ پاکیزہ گروہ ہے جو اس کائنات میں مقدس ترین
 امانت کا امین اور افضل ترین وراثت کا حامل ہے۔ یہ جماعت اس امت میں
 پسندیدہ اور برگزیدہ ہے حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں:

ثُمَّ أَقْبَلْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا

یہی لوگ کامل تقویٰ اور خشیتِ الہی کی صفت سے متصف ہیں، انما ینحشی
 اللہ من عبادہ العلماء، اور یہ وہ صفت ہے جس پر انسانی فضیلت کا

دار و مدار ہے۔

قیامت کے دن جب دوسرے لوگ اپنے بینک بلینس، کارخانے،
 جاگیریں اور جائیدادیں پیش کریں گے، یہ حضرات اپنا سرمایہ کتابِ الہی،
 بارگاہِ الہی میں پیش کر دیں گے۔ یہ حضرات اس دن بہت بڑے سرمایہ دار
 اور دولت مند ہوں گے۔ آیاتِ الہیہ پڑھتے جائیں گے اور درجاتِ عسکریہ پر

چڑھتے جائیں گے۔ اللہم اجعلنا منهم بفضلك و منك۔
 بر اور ان اسلام انہما کی قسم! دنیا کے عہدے اور مناصب، عزتیں اور فقیہیں
 سب فانی اور عارضی ہیں۔ لیکن پھر بھی آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی اولاد دنیا کی
 تعلیم سے آراستہ ہو کر نام پیدا کرے اور آپ کے لیے باعث عزت و افتخار
 بنے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ یہ بھی ضرور چاہیں گے کہ آپ کی اولاد اعلیٰ عہدوں
 پر فائز ہو، اور آپ کو ایسے روشن تاج پہنائے جائیں جن کی روشنی کے سامنے
 چاند اور سورج کی روشنی بھی کوئی حقیقت نہ رکھتی ہو۔ اگر ایسا ہے تو
 اپنی اولاد کے سینوں کو قرآن مجید سے معمور کر دیجئے۔ آپ کے تمام مقاصد
 پورے اور تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ دنیا کی عزتیں بھی ملیں گی اور
 آخرت کی بھی۔

از تلاوت بر تو حق دارد کتاب

توازد کامی کہ می خواہی بیاب

ہماری دعا ہے حق تعالیٰ ہمیں قرآن مجید پڑھنے، یاد کرنے اور اس پر عمل
 کرنے کی توفیق بخشیں۔ حضرت قاری صاحبؒ کی خدمات کو قبول فرمائیں۔ ان کی
 قبر کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنائیں اور انہیں جنت الفردوس
 نصیب فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

محمد عارف، مسجد ہوسٹل کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور

۳۱ اگست ۱۹۶۱ء

کچھ اس کتاب کے بارے میں

یہ کتاب حضرت مولانا حافظ قاری فضل کریم صاحب کے مختصر حالات زندگی پر مشتمل ہے۔ اس کے لکھنے سے عرض یہ ہے کہ حضرت قاری صاحب کا تذکرہ آپ کے احباب، علماء، حفاظ و قراء اور تلامذہ میں باقی رہے اور بعد میں آنے والے طلباء بھی قاری صاحب کے حالات زندگی سے کسی حد تک واقف ہو سکیں۔ نیز خود حضرت قاری صاحب کی اولاد، خاندان اور آنے والی نسل کے لیے بطور یادگار باقی رہے۔

یہ کتاب چند مضامین پر مشتمل ہے۔ قاری صاحب کے حالات زندگی جمع کرنے کا خیال سب سے پہلے قاری فیوض الرحمن صاحب کو ہوا۔ عزیز موصوف، آپ کے ان خصوصی تلامذہ میں سے ہیں، جو اپنے استاذ مکرم سے بہت عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔ چنانچہ عزیز محترم نے اکابر اور احباب سے ذکر کیا تو سب نے تائید کی۔ پھر ہفت روزہ خدام الدین میں، حضرت قاری صاحب کے حالات حاصل کرنے کے لیے اپیل کی۔ اس پر بہن ام کلثوم صاحبہ (دختر حضرت قاری صاحب) اور قاری افضل الحق صاحب (فرزند حضرت قاری صاحب) نے ایک ایک

مضمون بھیج دیا۔ اس کے بعد قاری فیرض الرحمن صاحب نے اپنے اکابر سے درخواست کی تو حضرت مولانا قاری اظہار احمد تھانوی صاحب دامت برکاتہم اور حضرت مولانا قاری محمد شریف صاحب مدظلہم نے درخواست قبول فرماتے ہوئے اپنے مضامین مرحمت فرمائے۔ بعد ازاں اور چند اجاب کے مضامین بھی موصول ہوئے جو اس کتاب میں شامل کر دیے گئے ہیں۔

عزیز محترم قاری فیرض الرحمن صاحب نے مضامین کے حاصل کرنے میں بہت بھاگ دوڑ کی ہے۔ بفضلہ تعالیٰ میں یہ لکھنے میں حق بجانب ہوں کہ یہ کتاب عزیز ہی کی محنت اور کاوش کا نتیجہ ہے۔

اس کتاب میں سب سے پہلے بن صاحبہ ام کلثوم اور پھر قاری — افضال الحق صاحب کا مضمون ہے۔ بن، بھائی کی تحریر میں معلومات بھی ہیں کہ حضرت قاری صاحب کی تربیت انہیں ایک طویل عرصے تک نصیب ہوئی ہے اور جذباتِ غم بھی ہیں جو دل کی گرائیوں میں جمع ہوئے اور الفاظ کی شکل میں نمودار ہوئے۔

تیسرا مضمون حافظ قاری عبد المجید صاحب ہزاروی کا ہے۔ اس میں قاری عبد المجید صاحب نے مدرسہ کے مختصر حالات، حضرت قاری صاحب کی طلباء پر شفقت و محبت اور ان کی پر تاثیر تلاوت کا ذکر کیا ہے۔ یہ مضمون اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ موصوف نے سعودی عرب سے آسان عربی میں لکھ کر روانہ کیا ہے۔ قاری عبد المجید صاحب حضرت قاری

صاحب کے لائق اور اہل شاگردوں میں سے ہیں۔ آپ کی سعادت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ آپ بلد الامین میں، اللہ تعالیٰ کی کتاب میں پڑھا رہے ہیں۔

چوتھا مضمون پروفیسر احمد خالد عمر صاحب ایم اے نے بھیجا ہے۔ آپ حضرت قاری صاحب کی تلاوت سن کر محظوظ ہوتے رہے ہیں۔ اور جو کیفیت سماع کے وقت طاری ہوتی رہی، اسے بیان کر رہے ہیں۔ حضرت قاری صاحب کی روانی اور لہجہ سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ نہایت خلوص اور محبت سے مضمون لکھا ہے۔

پانچویں نمبر پر حافظ قاری محمد اقبال صاحب کا مضمون ہے۔ آپ راولپنڈی مدرسہ تعلیم القرآن میں شعبہ تجوید و قرأت کے صدر اور انچارج ہیں۔ آپ کی طبیعت میں بانگین اور لطافت ہے، تجوید میں خوش الحانی اور لطافت ہے، جامعہ اشرفیہ کے فارغ التحصیل ہیں اور قرأت سبعہ کے قاری ہیں۔

چھٹا مضمون میرے محترم و مکرم بھائی حافظ قاری فیوض الرحمن صاحب کا ہے۔ آپ گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں شعبہ اسلامیات کے صدر ہیں۔ آپ کا خدز سن کر مجھے بعض اوقات حضرت قاری صاحب یاد آجاتے ہیں۔ مدوجزر اور لہجہ میں حضرت قاری صاحب کا رنگ کافی حد تک محسوس ہوتا ہے۔ عزیز محترم امتیازی سندات کے حامل ہیں اور دینی خدمات کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں۔ اسٹاذ مکرم سے متعلق آپ نے اپنے چند تاثرات کو عقیدت و محبت، ادب و احترام اور احساساتِ غم کے ساتھ، بڑے پیار سے انداز میں سپرد قلم

کیا ہے۔

ساتویں نمبر پر استاذ القراء والمجودین حضرت مولانا قاری اظہار احمد صاحب
مخانیوی دامت برکاتہم کا ادیبانہ، عالمانہ اور فاضلانہ مضمون ہے۔ آپ صاحب
قلم اور صاحب لسان ہیں۔ علوم دینیہ کے مستند عالم ہیں۔ بڑے محقق قاری
ہیں۔ تجوید و قرأت کے حقائق، دقائق اور لطائف سے باخبر ہیں۔
آپ نے تجوید کی بعض کتابوں کا بہت عمدہ ترجمہ کیا ہے اور خصوصاً
شاطبیہ جیسی ادق اور مشکل کتاب کا اردو میں مختصر اور جامع ترجمہ و شرح کے
قرارت کے طلبہ پر احسان عظیم فرمایا ہے۔ آپ مدرسہ تجوید القرآن موتی بازار میں
میں (جس کی بنیاد حضرت قاری صاحب نے رکھی ہے) میں شعبہ تجوید و قرأت
کے صدر ہیں۔ آپ کے شاگرد قرار اطراف ملک میں تجوید و قرأت پڑھا رہے
ہیں۔

آٹھواں مضمون استاذ القراء حضرت مولانا قاری محمد شریف صاحب
مدظلہم نے مرحمت فرمایا ہے۔ آپ مدت دراز تک حضرت قاری صاحب کے
رفیق کار رہے ہیں اور خود ان کے بقول شرف تلمذ بھی حاصل ہے۔ آپ
وار القراء ماڈل ٹاؤن کے صدر مدرس، بانی اور مہتمم ہیں۔ مضبوط مجود اور سچے
قاری ہیں۔ سینکڑوں طلبہ فن تجوید اور قرأت میں آپ سے فارغ ہو کر
ملک کے گوشے گوشے میں قرآنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ کا فیضان
عام اب بھی جاری ہے۔ موتی بازار میں حضرت قاری صاحب کے ساتھ مل کر
تجوید و قرأت کی بنیاد آپ ہی نے رکھی۔ پھر اس فن کو خوب فروغ دیا۔

آپ اعلیٰ درجہ کے مصنف ہیں۔ آپ نے تجوید کی متعدد کتابیں نہایت سہل انداز میں تالیف فرمائی ہیں۔ آپ کا مضمون معلومات سے پر ہے اور کئی صفحات پر مشتمل ہے۔

مؤخر الذکر دونوں بزرگوں کے مضامین کتاب کی جان ہیں۔ اسی لیے کتاب کے آخر میں رکھے گئے ہیں۔ ان اکابر کے مضامین پر میرے جیسا نا اہل مزید تبصرہ کی ہمت نہیں رکھتا۔ بس اسی شعر پر اکتفا کرتا ہوں۔

زبدِ رحِ نامِ ماجِمالِ یارِ مستغنی ست!

آبِ وزنگ و خال و خطِ چہا چہا روتے زیارا

میری دعا ہے کہ حق تعالیٰ عزیزِ محترم حافظ قاری فیوض الرحمن صاحب کو جزائے خیر دیں۔ بیش از بیش پر مخلوص خدماتِ دینیہ کی توفیق بخشیں۔ میں اپنے بزرگوں اور احباب کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے مضامین بھیج کر حوصلہ افزائی فرمائی اور ان بھائیوں کا بھی جنہوں نے کتابت و طباعت کے سلسلہ میں تعاون کیا۔ جزاہم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء فی الدنیا والآخرۃ

محمد عارف ایم اے

یہ مضمون محترمہ بہن "ام کلثوم بٹ صاحبہ" نے حضرت الاستاذ
 کی سوانح کے لیے لکھ بھیجا ہے۔ یہ بڑا معلوماتی مضمون ہے۔ اللہ تعالیٰ
 انہیں جزائے خیر دیں کہ اپنی گونا گوں گھریلو مصروفیات کے باوجود وقت
 نکال کر میری درخواست پر یہ مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ اگر وہ یہ مضمون
 لکھتیں تو میرے لیے مذکورہ سوانح حیات کا لکھنا بہت مشکل ہو

جاتا۔

فیوض الرحمن ایم اے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

برادر محترم قاری فیوض الرحمن صاحب

سلام مسنون!

۷ اگست کے شمارہ خدام الدین میں آپ کی جانب سے کی گئی اپیل کے تحت قاری فضل کریم صاحب مرحوم مغفور کے حالات لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ حالانکہ میرا طرز بیان قابل اشاعت نہیں ہے۔ آپ اس کو مناسب تریم اور تبدیلی کے بعد طبع کرالیں

والسلام

آپ کی بہن :-
دختر قاری فضل کریم صاحب مرحوم

۷۰/۸/۲۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حضرت قاری صاحب کے مختصر حالات

بن ام کلثوم صاحبہ دختر حضرت قاری صاحب

پیدائش

شیخ حاجی حافظ قاری کریم صاحب ۱۹۰۲ء کے لگ بھگ امرتسر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام حاجی مہتاب الدین مرحوم تھا۔ اجداد ہندو تھے۔ تین چار پشتوں سے اللہ نے اسلام کی توفیق نصیب فرمائی۔ قاری صاحب مرحوم، اپنے والد ماجد کے نکاح ثانی سے تھے۔ پہلے نکاح سے صرف ایک بچی کی پیدائش کے بعد والدہ ماجدہ انتقال کر گئیں۔ دوسرے نکاح سے سات بچے ان سے پہلے پیدا ہوئے مگر رضاع الہی وفاق پا گئے ان کی والدہ ماجدہ بہت زیادہ غمگین رہنے لگیں۔ اسی غم میں گھل گھل کر نہایت لاغر ہو گئیں۔ ان کے والد ماجد کسی بزرگ کے پاس دعا کی درخواست کے لیے گئے۔ انہوں نے انہیں تسلی دی اور اولادِ صالح کے لیے دعا فرمائی اور ساتھ ہدایت فرمائی کہ آپ کو جو اولاد اللہ پاک عطا فرمائیں۔ اس کی پیشانی کو سونے کی آگ میں گرم شدہ سونے کی بہت موٹی گولی سے وارغ دے دیں اور اس بچے کا نام سچی رکھیں۔ انشاء اللہ حکم الہی سے بچہ محفوظ رہے گا۔ چنانچہ ان کی پیدائش پر حسب ہدایت عمل کیا گیا۔ وارغ کا نشان تادم حیات محراب کے نشان

کے نیچے موجود تھا۔ اور ان کا نام بھی سچی ہی رکھا گیا۔ اللہ کی قدرت اولاد کو گود میں کھیلنے دیکھ کر خوش ہونے کی حسرت لے کر ان کی والدہ ماجدہ انہیں چھوڑ کر داعی اجل کو لبیک کہ گئیں۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ والدہ ماجدہ کی وفات کے وقت قاری صاحب مرحوم کی عمر مشکل چند ماہ تھی۔

پرورش

والد بزرگوار نے بچے کی پرورش کے مشکل مرحلہ کو آسان بنانے کے لیے ایک بیوہ خاتون (جن کے اپنے چند ایک بچے تھے) سے نکاح کر لیا۔ مگر ان کا سلوک اس معصوم جان کے لیے بھی بے رحمتی سوتیلی ماؤں جیسا تھا۔ بحکم الہی، انہی دنوں سے بچھپک کی وفاق پھسل مرض کی وبا پھیل گئی اور قاری صاحب مرحوم بھی اس مرض کا شکار ہو گئے۔ ایسے موقع پر بجائے اس کے کہ والدہ محترمہ کے دل میں رحم کا جذبہ ابھرتا، ان کی نفرت اتہامی شدید ہو گئی۔ سچے تکلیف کی شدت سے تڑپتا دوسرے لکھیاں پر لیشان کرتیں مگر والدہ صاحبہ کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔ خوش قسمتی سے قاری صاحب محترم کے تایا جی مرحوم بھی ملحقہ مکان میں رہتے تھے۔ تائی صاحبہ بڑی نیک دل خاتون تھیں (اللہ پاک انہیں جنت الفردوس نصیب فرمائیں) انہوں نے ان کو گود میں لے لیا۔ ان کے ایک لڑکا تھا جس کا نام عبدالکریم تھا۔ پھر اسی نسبت سے انہوں نے عبدالکریم کے بھائی کا نام سچی سے فضل کریم رکھا اور یہ نام دینی حلقوں اور احباب میں ایسا مشہور ہوا کہ ان کا اصل نام سچی سب بھول گئے۔

تائی صاحبہ کے پاس جانے کے بعد ان کو بچھپک کا پھر پانچ دفعہ حملہ ہوا۔

اور اس طرح یہ قوتِ باصرہ، سامعہ اور لامسہ سے صرف ڈیڑھ برس کی تلبیل
 عمر میں محروم ہو گئے۔ ہسپتال سے اپریشن کے بعد نکھنے اور کانوں کے سوراخ
 اپریشن کے ذریعے بنائے گئے مگر آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ لیکن اللہ پاک نے
 آنکھوں کی کمی کو دیگر تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو چلا بخش کر پورا کر دیا۔
 "قادرِ مطلق کی ان کڑی آزمائشوں میں سے گزرنے کے بعد بھی ان کی سوتیلی
 والدہ محترمہ ان سے شفقت کا سلوک نہ کرتیں۔ اس کے برعکس یہ جب بھی اپنے
 بہن بھائیوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے اپنے والد صاحب کے گھر جاتے، تو والدہ
 صاحبہ ان الفاظ سے تواضع فرماتیں کہ:-

"حافظ کے لیے مسجد میں جگہ نہیں؟ وہ یہاں کیوں رہتا ہے؟"

والدہ کے ان الفاظ نے ان کے دل میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ میں ان سب گھر
 والوں پر بوجھ ہوں۔ والد صاحب اچھا سلوک کرتے تھے اور ان کی خوراک، لباس
 کا ہر طرح خیال فرماتے تھے۔ یہ بات ان کی والدہ صاحبہ کو ایک آنکھ نہ بھاتی
 تھی جس کے باعث ان کے والدین میں اکثر و بیشتر لڑائی جھگڑا رہتا۔ یہ روز
 روز کے گھر بوجھگڑوں سے تنگ آچکے تھے۔ دوسرے والدہ صاحبہ کا دیا ہوا
 تاثر کہ حافظ کے لیے مسجد میں جگہ نہیں۔ انہیں خانہ خدا میں کھینچ لایا اور وہیں
 سے ان کی دینی لگن کی ابتداء ہوئی اور دینی خدمت کی انتہا تک پہنچی۔ اس لحاظ
 سے ان کی والدہ صاحبہ کا رویہ ان کے لیے نیکت قال ثابت ہوئی اور یہ دین
 کے فخلص اور مضبوط خادموں میں شامل ہوئے۔

قاری صاحب کے اساتذہ

ان کے اساتذہ کرام میں قاری کریم بخش صاحب مرحوم کا نام قابل ذکر ہے یہ صرف حافظ قرآن ہی نہ تھے بلکہ ایک مستند قاری اور لائق عالم بھی تھے۔

ابا جی اپنے دینی شوق، جذبہ کی تکمیل کے لیے لاہور شہر میں تشریف لے آئے۔ جہاں وہ انفرادی طور پر کام کرتے رہے۔ قیام لاہور میں پہلے عارضی قیام گاہ ڈاکٹر جلال الدین صاحب کا دولت خانہ تھی۔ ان ڈاکٹر صاحب کے قیام گاہ لاہور میں ٹھنڈی سڑک (Davis Road) پر تھی اور یہ دانتوں کے ماہر معالج تھے۔ ان کی بچیاں اور بچے قاری صاحب مرحوم سے درس کلام پاک حاصل کرتے تھے۔ وہیں ان کے قیام و طعام کا انتظام تھا۔ ڈاکٹر صاحب بہت معروف، دیندار اور بارسوخ بزرگ تھے۔ اس قیام کے باعث قاری صاحب مرحوم بہت ذہی اثر لوگوں سے متعارف ہوتے گئے اور رفتہ رفتہ ان کا حلقہ احباب وسیع ہوتا گیا اور لوگ ان کی عمدہ اور صاف تلاوت کلام الہی سے بہت متاثر ہوتے۔

تلاوت کلام پاک بہت عمدہ اور صاف تھی۔ اس طرح قرأت فرماتے کہ جادو کر دیتے۔ جوانی کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے ایک بزرگ نے بتایا کہ جامع مسجد نیلا گنبد میں ایک شخص ان سے کلام پاک سنا کرتے تھے۔ کلام پاک کے کسی خاص رکوع کی تلاوت کی فرمائش کی، اور اصرار کیا۔ آپ نے پڑھنا شروع کیا۔ وہ شخص ایسے متاثر ہوئے کہ بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو فرمانے لگے :-

” آپ کے پڑھنے میں جادو ہے۔ دل میں رقت پیدا ہو جاتی ہے۔“
حقیقتاً ان کے پڑھنے میں جادو تھا جو دلوں کو موہ لیتا تھا اور کلام پاک پڑھنے
کا شوق اور جذبہ پیدا کر دیتا تھا۔

پھر انہوں نے چند ایک شاگردوں کو لے کر اللہ تعالیٰ کے پاک نام سے مسجد
چینیا نوالی (بازار سر یا نوالہ) کو آباد کیا اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کی مساعی کو
قبول فرما کر دین کی خدمت کا ایک ایسا مضبوط پودا لگایا جس کی جڑیں اور شاخیں
مغربی پاکستان اور بیرونی ممالک تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ایک طویل مدت تک یہاں
کام کرنے کے بعد انہوں نے ایک اور مدرسہ قائم کیا جو کہ مدرسہ تجوید القرآن
کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مدرسہ اولاً کوچہ کنڈیگراں مسجد نور (موتی بازار) میں
قائم کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ اس مدرسہ کو اتنی رونق بخشی کہ مسجد نور کی
اپنی عمارت طلباء کے لیے ناکافی ہو گئی۔ پھر ایک مخیر شخص تھے جن کا اسم گرامی
شیخ عبدالحی تھا اور وہ اس مدرسہ کی مجلس کے ممبر بھی تھے۔ انہوں نے اپنے
ذاتی مکان کا بالائی حصہ مسجد کے لیے وقف کر دیا مگر پھر بھی یہ ساری جگہ طلبوں
کے لیے کافی نہ ہو سکی تو اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد شامل حال ہوئی اور قریب ہی
ایک بہت بڑی حویلی تھی، جہاں لوگ رنگریزی کا کام کرتے تھے۔ اس جگہ کو اللہ
تعالیٰ نے یہ سعادت نصیب فرمائی کہ اس کو پاک کر کے کلام پاک کی خدمت
کے لیے وقف کر دیا۔ یہ حویلی مدرسہ کی خاطر خرید لی گئی اور اسی حالت میں
اس میں خدمت کلام پاک کا کام شروع کر دیا گیا اور مدرسہ تجوید القرآن
مسجد نور سے منتقل ہو کر اس جگہ آ گیا۔

بعد ازاں اللہ تعالیٰ کی مزید کرم نوازی ہوئی۔ اللہ پاک نے مدرسے کی مالی حالت بہتر بنادی اور اس عمارت کو مکمل طور پر منہدم کر کے از سر نو مدرسے کی ضروریات کو مد نظر رکھ کر تعمیر کیا گیا۔ اس میں ایک چھوٹی سی مگر بہت ہی پیاری مسجد بھی بنی ہوئی ہے۔ یہاں کم از کم چار سو طالب علم فیض یاب ہو رہے ہیں۔ بیرون شہر سے بھی کچھ طلباء آئے ہوئے ہیں۔ جو مدرسہ ہی میں رہائش پذیر ہیں۔

خدا کرے قاری فضل کریم صاحب مرحوم کا لگایا ہوا یہ پودا ہمیشہ سرسبز و شاداب رہے اور مسلمان اس سے فیض یاب ہوتے رہیں اور ان کے لیے صدقہ جاریہ ثابت ہو کلام پاک پڑھنے اور پڑھانے کا ثواب ان کے نامہ اعمال میں ثابت شامل ہوتا رہے۔ آمین

قاری صاحب مرحوم صرف باوقار شخصیت کے مالک انسان ہی نہ تھے بلکہ ایک لائق، تجربہ کار، دیانتدار، محنتی اور فرض شناس استاد بھی تھے۔ بحیثیت استاد بہت کامیاب انسان تھے۔ سرکش سے سرکش طالب علم ان کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ ان کا احسان اور قوتیں اتنی قوی تھیں کہ دیکھنے والوں کی عقل ذگ رہ جاتی تھی۔

میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ طالب علم کلام پاک زبانی سنانے سنانے ادھر ادھر متوجہ ہو کر بیٹھے ہی بیٹھے ہاتھوں سے کھیلنے لگتے۔ حالانکہ آواز ایک رتی بھی پیدا نہ ہوتی مگر انہیں علم ہو جاتا کہ وہ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ اشاروں کنایوں میں مصروف ہیں۔

میں نے ایک دفعہ جب بچے جاچکے تو ان سے پوچھا۔ آپ کو کیسے علم ہو جاتا ہے؟ تو فرمانے لگے کہ۔

”آواز کا رخ بدل جاتا ہے، چہرہ دوسری طرف کرنے سے آواز

کی سمت بدل جاتی ہے۔“

اسی طرح اگر کوئی شاگرد (حفظ کا) دیکھ کر سنانا شروع کر دے کہ سبق یاد نہ ہونے کے باعث ڈانٹ ڈپٹ سے پرچ جائے، لیکن انہیں علم ہو جاتا۔ شاید سبق یاد نہ ہونے کی صورت میں تو سبق یاد کر دیتے مگر دھوکہ بازی کے باعث بچے سرزنش سے نہیں بچا کرتے تھے۔

مندرجہ بالا مثالیں قاری صاحب کے ذوق و شوق، تجربہ اور مہارت

کی دلیل ہیں۔

بے مثال قوتِ حافظہ اور قوتِ لامسہ

ان کے احساسِ لطیف کا ایک آدھ واقعہ عرض کروں۔

ایک دفعہ ایک صاحب انہیں امرتسر کے ریلوے اسٹیشن پر ملے، ہاتھ ملایا اور تھوڑی دیر گفتگو کی اور چلے گئے۔ پورے بیس سال کے بعد انہی صاحب سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ ان کے ساتھ ایک اور صاحب تھے ان صاحب نے کہیں ان سے قاری صاحب مرحوم کی قوتِ حافظہ اور قوتِ لامسہ کی تعریف کی۔ وہ آزمانے پر تڑپ اٹھے۔ لہذا وہ صاحب خود نہیں سے بولے جو کہ بیس سال بعد مل رہے تھے۔ صرف قاری صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا دوسرے صاحب فرمانے لگے آپ نے انہیں پہچانا؟ اباجان

نے ان کے ہاتھ کا، سٹیلی اور پشت کی جانب سے پورا جائزہ لیا۔ پھر فرمانے لگے کہ

”ان صاحب کا یہ نام ہے اور میں آج سے بیس سال پہلے ان

سے امرتسر ریلوے سٹیشن پر ملا تھا“

وہ صاحب بے حد حیران ہوئے۔

اسی طرح اگر تارہی صاحب کے پاس کپڑا یا چلنی کے مختلف کوالٹی کے

رتن لاکر رکھ دیے جاتے۔ اور انہیں سب سے عمدہ چیز علیحدہ کرنے کا کہا جاتا

تو صرف ہاتھوں سے چھو کر ہی پہچان لیتے تھے اور ہمیشہ بلا سبالغہ عمدہ چیز ہی کا

انتخاب فرماتے تھے۔

ایک دفعہ ایک صاحب فرمانے لگے کہ اگر میں آپ کے پاس سے کچھ حالت

بیداری میں چرا کر لے جاؤں تو آپ کبھی گرفت نہ کر سکیں گے۔ مذاق میں انہوں نے

کچھ اشیاء لاکر پاس رکھ دیں۔ مختلف اطراف میں چیزیں پڑی تھیں۔ ان صاحب

نے جونہی اشیاء پر ہاتھ مارا، ابا جان نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ اس قدر بوکھلا

کہ انہیں کچھ سوچنا ہی نہ تھا۔ پھر انہوں نے اصرار کر کے پوچھا کہ آپ کو کیسے پتہ

چلا؟ انہوں نے فرمایا کہ :-

”اشیاء پر مکھیاں بیٹھ گئی تھیں۔ آپ کے ہاتھ مارنے سے

مکھیاں اڑیں تو میں نے سمت کا اندازہ لگا لیا اور یوں آپ

پکڑے گئے۔“

وہ ہمیشہ ہاتھوں کی بناوٹ سے اجباب کو پہچان لیتے تھے۔

لائق اور نیک استاد

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جو بھی کوئی شاگرد بنتا، جھولی بھر کر ہی جاتا۔ ان کی منزل اتنی پختہ تھی اور تجربہ اتنا تھا کہ اپنے طور پر انہیں پڑھنے کی ضرورت نہ تھی و ایسے حصولِ ثواب کے لیے کثرت سے تلاوتِ کلامِ پاک فرمایا کرتے تھے۔ ان کا کم و بیش چالیس سال کا تجربہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کامیاب سماعت فرما۔ تھے۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ اگر حافظ بھولنے لگیں تو سامع گہرا ہٹ میں خود بھی بھول جاتے ہیں یا بار بار بتا کر انہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا اپنا بھی بھول گیا ہے۔ مگر قاری صاحب مرحوم ان تمام باتوں سے بہت بالا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت مصروف کاروباری حفاظ جن کی منزلیں بھی زیادہ پختہ نہیں ہوتی تھیں۔ قاری صاحب سے استفادہ کرتے تھے۔ خصوصاً رمضان المبارک سے دو ایک ماہ پیشتر اور رمضان المبارک اٹھائی مصروف گزرتا۔

بہت محنتی استاد تھے اور خدمتِ کلامِ پاک بحیثیتِ ملام نہیں کرتے تھے۔ عام طور پر مشاہدہ میں یہ بات آتی ہے کہ لوگ گنتی کے گھنٹے پورے کر نیکی کوشش کرتے ہیں مگر اباجی دل سے کام کرتے اور یہ کبھی نہیں سوچتے تھے کہ میرا پڑھانے کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ لہذا میں چھٹی کر لوں، بلکہ یہ چھٹی کے اوقات میں بھی جن بچوں کے اسباق یاد نہ ہوتے انہیں سبق یاد کرنے میں مدد دیتے۔ یہاں تک کہ جب ان کا گھر مدرسے کے قریب تھا تو طلباء کو ساتھ گھر لے آتے۔ خود کھانا کھاتے اور طالب علم سبق یاد کرتے اور سنا کر چھٹی کرتے۔ بیرون شہر کے طلباء کی نگرانی بھی خود ہی کرتے تھے۔

سچیت وارڈن یہ بیرونی طلباء کی نگرانی فرماتے اور ان کی تربیت اور اخلاقی اصلاح کا حد درجہ خیال رکھتے تھے۔

حیا

بہت باحیا اور غیرت مند انسان تھے۔ ان کے شاگردوں میں طالبات بھی ہوتی تھیں۔ یہ کبھی بھی بے ہشجک بچپوں کے سامنے نہیں جاتے تھے، بلکہ جہاں لڑکیاں ہوتی وہاں پہلے کم مگر چند ایک لڑکوں کو سبق یاد کرنے کے لیے بھیج دیتے پھر خود تشریف لے جاتے۔ کبھی لڑکیوں کے بالکل سامنے منہ کر کے نہ بیٹھتے تھے، بلکہ ہمیشہ قدرے رخ موڑ کر بیٹھتے۔ اگر بچیاں گھر پر پڑھنے آئیں تو امی جان کو یا مجھے پاس بٹھاتے پھر طالبات کو سبق پڑھاتے۔

اگر کوئی بی بی گھر پر ملنے کے لیے آجاتی تو فوراً اٹھ کر تشریف لے جاتے اگر باہر سے آرہے ہوتے اور کسی غیر محرم عورت کی آواز سن پاتے تو الٹے قدموں واپس لوٹ جاتے۔ حتی المقدور کبھی کسی عورت کا سامنا نہیں کرتے تھے۔
غیر تو غیر غیر محرم ہوئیں۔ ایک دفعہ مجھے بہت تیز سہارا گیا جس سے سر سامی کیفیت ہو گئی۔ شفقت سے میرا سر دابنے لگے مگر اپنا تویہ پہلے میرے ماتھے پر ڈال لیا کہ میرا ہاتھ اس کی پیشانی سے مس نہ کرے۔ یہ پرایا دہن ہے۔ ان کی اس بات نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ وہ دنیا داری کی خاطر بھی حیا کے اس بلند مقام کو بالائے طاق رکھنے کے لیے تیار نہ تھے، جو انہوں نے اپنا نصب العین بنا لیا ہوا تھا۔ ان کے بھائی عبدالحمید صاحب نے بھتیجی کے سر پر دستِ شفقت پھیرنے کی فرمائش کی تو مجھے فرمانے لگے:

”میری طرف سے تم اس کے سر پر ہاتھ پھیر دو۔“

عفو و درگزر

بہت سادہ طبیعت اور نیک دل تھے۔ سادہ لوح اس قدر تھے کہ صحیح طور پر اس حدیث پاک کے مصداق تھے۔

أَمْحَابُ الْجَنَّةِ بُلَّةٌ

کوئی شخص الزام تراشی کرتا یا گالی گلوچ دیتا تو اس کے چلے جانے کے بعد قاری صاحب اللہ واسطے معاف فرمادیتے۔ اگر کوئی جھوٹے منہ کہہ دیتا مجھے معاف کر دیں تو اگلے پچھلے سارے گلے شکوے دھوڑا لیتے اور پہلے سے زیادہ خلوص اور تپاک سے ملتے اور اس کی غلطی جھولے سے بھی نہ جانتے۔ اگر ہم کہیں کہ وہ آپ کی راہ میں کانٹے بوتا ہے، آپ کو تنگ کرتا ہے۔ پھر ایسے ہو جاتے ہیں جیسے اس کے بغیر گزارہ نہیں تو فرماتے۔

”خَيْرٌ لَّنَا شَرٌّ لَّا عَدَايْنَا۔ میں بد نیت نہیں ہوں

انہیں نیت کا بدلہ مل جائے گا۔ جو برائی کرے گا۔“

مہمان نوازی، حسن سلوک

کوئی غیر سے غیر انسان بھی کیوں نہ ہو ایسے گھل مل جاتے، جیسے برسوں سے شناسائی ہو۔ اپنی حیثیت کے مطابق اس کی مہمان نوازی فرماتے اور اس کو یہ باور کرا دیتے کہ خود غرضی اور نفسا نفسی کے اس زمانے میں بھی ابھی مخلص لوگ باقی ہیں اور جس سے یہ ایک ملتے وہ ان سے بار بار ملتا۔ ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ دور کے رشتہ داروں اور ان کے قرابت داروں سے اس

طرح ملتے تھے جیسے ان کے حقیقی بہن بھائی اور بچے ہوں۔ ہر کسی کے دکھ درد کے لیے اپنے دل میں اتہائی کرب محسوس کرتے۔

صلح جو

اگر کسی کے متعلق سن پاتے کہ آپس میں ناراض ہیں، اپنی پوری کوشش سے احکام خداوندی اور ارشادات نبویؐ سنا سنا کر اس طرح نرم کرتے کہ وہ صلح کرنے پر مجبور ہو جاتے اور اپنے دل میں خوفِ خدا محسوس کرنے لگ جاتے پھر ان کی صلح ہمیشہ قائم رہتی۔ ان کی صفتِ اصلاح کے باعث اکثر غیر لوگ اپنے گھریلو جھگڑے منانے کے لیے بھی ان سے رجوع کرتے۔ یہ ان کی صلح منافی کرانے کے بعد اپنی رقم سے شیرینی بانٹ کر سب کو شیر دہن کی تلقین فرماتے۔ کئی اجڑے گھرانے کے سمجھانے سے بس گئے تھے۔

فیاضی اور رحم دلی

کوئی بھی سوالی آجاتا اسے بخالی نہ لوٹاتے۔ عموماً لوگ گاؤں میں سوائیوں کو سمٹی بھراٹھیا کا پیسہ دے دیتے ہیں مگر وہ دینی چوٹی سے کبھی کم نہ دیتے۔ ٹوٹے ہوئے پیسے پاس نہ ہوں تو روپیہ ہی دے دیتے۔ اکثر مسکھانی پھل منگوا کر غریبوں میں تقسیم کرتے کہ غریبوں کو ایسی نعمتیں کم ہی ملیں گی۔ کوئی بھی آکر اپنی مالی پریشانی کا ذکر کرتا۔ جو بھی بن پڑتا۔ کپڑے پیسے سے اس کی مدد فرماتے۔ حالانکہ اکثریت لوگوں کی بظاہر ان سے زیادہ خوش پوش ہوتی۔

روپے پیسے کا لالچ نہ تھا۔ اپنے پاس ۲۵ روپے سے زیادہ رقم کبھی نہ رکھتے، فرماتے کہ:

”میرا ایمان ہے، دولت مصیبت لاتی ہے“

لہذا بتایا سب کچھ راہِ مولادے دیتے اور خود فرماتے:-

”جہاں تقویٰ رب داتا ہاں رزق ہمیش

پلے خرچ نہ بندے پھچھتی درویش“

اور خدا کی قدرت میں نے آج تک انہیں اللہ کے فضل و کرم سے کبھی مالی پریشانی میں مبتلا نہیں دیکھا۔ کبھی پلے نہ بھی ہوتا تو گھبراتے نہیں تھے بلکہ یہ اکثر و زبانی سنا تھا:-

حسبنا اللہ و نعم الوکیل نعم المولیٰ و نعم النصیب

اور ان کے مولیٰ اس طرح ان کی کفالت فرماتے اور غیب سے مدد فرماتے کہ اس کے عالم غیب ہونے کا اگر کسی شخص کو شک بھی ہو تو وہ یقیناً ایمان لے آئے کہ رب سچا یقیناً عالم غیب ہے۔ جیسا ان کی خفیہ ضرورت جس کا انہوں نے کسی سے اظہار بھی نہیں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے پوری فرمادی۔

ایک واقعہ انہیں کی زبانی سنا تھا من و عن عرض ہے۔ فرمانے لگے:-

”یہ اس زلزلے کا ذکر ہے جب کہ وہ مسجد چینیانوالی میں درس

کلام پاک دیا کرتے تھے اور ان کی تنخواہ صرف ۱۵ روپے ماہوار۔

تھی۔ میرے بڑے بھائی گلزار جان دستونی ۲۳ فروری ۱۹۶۴ء

بروز پیر، بیمار تھے۔ مالی پریشانی تھی۔ میں نے اللہ پاک کے حضور

دعا کی کہ الہی! میں اگرچہ ایک ناچیز، عاجز اور کم ہمت انسان ہوں

مگر آج تک یہ دست سوال کسی کے سامنے کبھی پھیلا یا نہیں،

کیونکہ توہی حاجت روا ہے۔ توہی میری ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہے۔ میری حاجت روائی فرما۔“

ان کا کہنا ہے کہ:-

”میں نماز فجر کے لیے مسجد میں گیا۔ ایک نیک بزرگ تھے (اللہ پاک انہیں عزیزی رحمت فرمائیں) جن کا نام ضیاء اللہ تھا۔ اب بھی ان کی پنجاب سوپ فیکٹری شیرانوالہ گیٹ موجود ہے۔ وہ بھی مسجد چینیوالی میں ہی نماز ادا کرنے کی غرض سے تشریف لایا کرتے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر فرمانے لگے۔ میں آپ کچھ تقاہت محسوس کرتا ہوں۔ میں نے طاقت کی گولیاں اپنے لیے بنائی ہوئی ہیں۔ چند ایک آپ کے لیے بھی لایا ہوں۔ آپ صبح، دوپہر، شام، ایک ایک گولی کھالیا کیجئے۔“

اباچی فرماتے تھے:-

”یہ گولیاں بناوٹ کے لحاظ سے دو قسم کی تھیں۔ ایک قسم دوپہر کے وقت کھانے کو بنا گئے۔ دوسری قسم صبح شام استعمال کے لیے میں نے ممنونیت کا اظہار فرمایا۔ انہوں نے عقیدت کا اظہار فرمایا۔ گھر لا کر میں نے گولیوں کا ذائقہ چکھنے کے لیے ایک گولی کھولی۔ اس میں سے دو اٹھنیاں برآمد ہوئیں۔ دوسری قسم کی گولی کھولی تو اس میں سے چار چوٹیاں نکلیں۔ یہ گولیاں کل تعداد میں سچاس تھیں۔ اللہ پاک کا شکر ادا کرتے ہوئے، میری آنکھیں

پر غم ہو گئیں کہ اس نے اس کھٹن موقع پر میری کس طرح دستگیری فرمائی
جس کا تصور ایک انسان کہہ ہی نہیں سکتا۔ یوں میرا مولا میری کفالت
فرماتا ہے۔

جائیداد

قاری صاحب مرحوم اس طبیعت کے مالک تھے کہ ان کے بھائیوں نے جو کہ
ان کی سوتیلی والدہ صاحبہ سے تھے، ان کا جائیداد کا حصہ آج تک نہیں دیا۔ ان کی
ذاتی جائیداد امرتسر میں تھی۔ تقسیم ہند کے بعد بھائیوں نے حیدرآباد میں کلیم کر
کے جائیداد حاصل کر لی۔ ان سے مختار نامہ لکھوایا کہ آپ معذور ہیں۔ میں جائیداد
حاصل کر کے آپ کا حصہ آپ کو ادا کر دوں گا۔ پھر انہیں آج کل پڑتال رہے۔
ہم نے زندگی کا بیشتر حصہ کراہی کے مکانوں میں گزارا ہے۔ امی جان مرحومہ فرماتیں کہ
”ہم تو کراہی کے مکان پر دوٹکے کھاتے ہیں اور دوسرے بہن

بھائی آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں۔“

پھر اللہ پاک نے اپنی رحمت سے ذاتی مکان جیاموٹے عطا کر دیا اور گھر
کی ضروریات بڑھی اچھی پوزی ہو جاتی تھیں۔ اباجان نے امی جان سے وعدہ
فرمایا تھا کہ۔

”عبدالعزیز صاحب مرحوم میرا حصہ دیں گے تو آپ کو زیارت

بیت اللہ کے لیے لے جاؤں گا۔“

انہوں نے حصہ نہ دیا۔ امی جان فرماتے لگیں کہ:-

”ہم نے اپنا پیٹ کاٹ کر مکان بنایا ہے مگر عبدالعزیز نے

کچھ نہیں دیا

وہ فرماتے :-

”عبدالعزیز نے نہیں دیا۔ ”عزیز“ نے تو سب کچھ دے دیا ہے

نا۔ آپ شکوہ نہ کریں۔ عبدالعزیز کی کسر پت عزیز جو پوری کر چکے ہیں۔

عبدالعزیز صاحب نے اپنا بوجھ نہ اتارا اور نہ ہی ابا جان مرحوم امی جان مرحوم سے

کیا ہوا حج بیت اللہ کا وعدہ وفا کر سکے۔ مگر انہوں نے زندگی بھر نہ خود شکوہ کیا،

اور نہ ہی گھر کے کسی فرد کو کرنے دیا۔ یہاں تک کہ ہم سب بہن بھائیوں کو بھی منع

کر دیا کہ آپ ان کی یتیم اولاد سے اسی طرح حسن سلوک سے پیش آئیں جس

طرح میں زندگی بھر ان کے ساتھ رہا ہوں۔ اور اپنے دل میں کبھی دولت کے

لاپچ کو جگہ نہ دیں۔ انہیں خلوص نیت کا اللہ پاک کے فضل و کرم سے تمام

زندگی عمدہ پھل ملتا رہا۔

قاری صاحب کی منکسر المزاجی

ان کی کسی بات سے کبھی تخاصم یا مجبور کی بونہیں آتی تھی۔ باوجودیکہ اللہ پاک

نے انہیں عالی مرتبت انسان بنایا تھا مگر ان کی چال ڈھال، لباس، گفتگو اور

خوراک ہمیشہ عاجزانہ ہوتی تھی۔ کبھی کسی ایسے عمل کا ارتکاب نہ فرماتے جس سے

عزور کی بو بھی آئے۔ کبھی کوئی اپنی عمر سے عمر، رتے میں چھوٹا بھی ہوتا تو سلام

میں پہل فرماتے۔ بات بڑی شفقت سے کرتے اور توجہ سے سنتے۔ کبھی ریشم یا

زرق برق لباس نہ پہنتے۔ ہمیشہ ٹخنوں سے اونچا پاجام پہنتے۔ اگر کوئی عزیز یا

شاگرد کبھی ہدیہ کوئی کپڑے وغیرہ بنا کر پیش کرتا۔ وہ خواہ کتنے ہی معمولی کیوں

نہ ہوتے، بڑے شوق اور خوشی سے پہن لیتے تھے۔ یہ ان کے دل میں کبھی نہیں آیا تھا کہ میرے شایان شان لباس ہو۔

ان کے عجز و انکسار کی ایک ہلکی سی جھلک پیش کرتی ہوں۔ گرمی کا موسم تھا۔ گھر پر کھانا کھانے کے لیے تشریف لائے۔ میں پاس نہ کھا ہلا رہی تھی۔ کھانے کے دوران ہاتھ سے روٹی کا ایک نوالہ گر گیا۔ روٹی کا وہ ٹیڑھا میں نے اٹھا لیا۔ اس کو تلاش فرمانے لگے۔ میں نے عرض کی:۔
 ”اباجان! یہ نوالہ میں کھا لیتی ہوں، آپ اور روٹی کھائیں“
 بعد ہو گئے کہ:-

”نہیں یہ نوالہ میں ہی کھاؤں گا۔ اگر میں نے نہ کھایا تو اللہ پاک کے ہاں شکر گنا جاؤں گا کہ رزق گر گیا تھا۔ اس کو اٹھا نہیں سکتے تھے؟“
 ”بجبر کیا۔ اس کو کھا نہیں سکتے تھے؟“
 ان کی ضد دیکھ کر میں نے نوالہ ان کے حوالے کیا۔ تب انہوں نے بقایا کھانا کھایا۔
 آپ کی دعا

اکثر یہ پڑھا کرتے تھے:-

اللَّهُمَّ أَحْيِنِي بِسَكِينَتِكَ وَأَمِتْنِي بِسَكِينَتِكَ وَأَحْسِنِي فِي نَائِمَتِكَ الْمَسَاكِينِ

اور حقیقی معنوں میں مساکین کی سی زندگی بسر فرمائی اور اپنے اہل و عیال کو بھی اسی کی تلقین فرماتے رہے۔

طہارت و پاکیزگی

طہارت و پاکیزگی ان کا شعار تھی۔ خوشبو پسند فرماتے، ہمیشہ پاک و صاف رہا کرتے تھے۔ لباس، جسم، زبان، خیالات کی پاکیزگی کی پاکیزگی کا بہت خیال فرماتے۔ میں نے آج تک ان کی زبان سے گالی گلوچ نہیں سنی تھی۔ کبھی کبھار نالائق شاگردوں پر استاد کو غصہ تو آہی جاتا ہے۔ سرزنش کے لیے غصے میں بعض اوقات شاگردوں کو بے وقوف، جلیث اور نالائق وغیرہ کہہ لیتے تھے۔ کبھی کسی کی بدگوئی نہ کرتے۔ چغلی نہ کھاتے، غیبت نہ کرتے، اگر کبھی کوئی غیبت کرنے لگتا تو فوراً منع فرما دیتے کہ اپنے ساتھ مجھے گناہگار نہ کرو۔ کبھی کسی سے لڑائی جھگڑا نہ کرتے۔ ہمیشہ زبان کی پاکیزگی کا خیال فرماتے۔

خیالات بھی بڑے ہی نیک رکھتے۔ کبھی لالچ نہ کرتے، حسد نہ کرتے۔ کبھی کوئی فحش کلامی نہ کرتے۔ نہ ہی ایسے رسائل و کتب کا سماع کرتے جو ہیجان انگیز ہوں۔ کبھی گھر میں کسی بچے کو کوئی ناول یا رسالہ پڑھتے ہوئے سن پاتے تو فوراً منع فرما دیتے۔ فرماتے :-

”اگر رسائل کا اتنا ہی شوق ہے تو آدھم مل کر رسائل پڑھنے

ہیں۔ جن میں دین و دنیا کا فائدہ ہو۔“

اس نیک غرض کے لیے انہوں نے تین رسائل پلے سے سالانہ چندہ ادا کر کے لگوا دیے۔ ”خدام الدین“، ”ترجمان اسلام“، ”پیام اسلام“۔ ان رسائل میں دین و دنیا دونوں مل جاتے ہیں۔ باقاعدہ خود بھی سنا کرتے اور ہمیں بھی پڑھنے کی ترغیب دیتے۔ دیگر کتب میں سے تفسیر ابن کثیر، سیرۃ صحابہ کرام پڑھنے کو عنایت

فرماتے۔ ہمیشہ خیالات، اعمال کی پاکیزگی کی تلقین فرماتے تھے۔ کبھی کسی کو گزند نہ پہنچاتے۔ دکھی بہن بھائیوں کی دل جوئی فرماتے، صابر رہتے، صبر کی تلقین فرماتے۔

شہ پاک ہی کو مولیٰ، رب، رازق، ناصر، خیر، علیم جانتے۔ جسم و لباس کو ہمیشہ صاف، پاک رکھتے۔ غسل فرماتے تو غسل کا حق ادا فرمادیتے۔ متنیجے وغیرہ کرتے تو طہارت کا پورا خیال فرماتے۔ اعضا و عضو کو نہایت اہتمام سے دھوتے۔ مبادا کوئی بال سوکھا رہ جائے۔

ہم لوگ پہلے شہر میں رہائش پذیر تھے۔ مدرسہ بھی تنگ گلیوں میں ہے جہاں مکان کی بالائی منزل سے پانی پر نالوں کے ذریعے نیچے آتا ہے۔ اگر کبھی کسی پر تالے سے پاؤں پر پھینٹے پڑ جاتے تو شک رفع فرمانے کی خاطر کسی کئی دفعہ دھوتے۔ پھر پورا غسل فرماتے کہ جسم کی طہارت تبرکی تنگی سے ان شاء اللہ محفوظ رکھے گی۔ جمعہ المبارک اور عیدین کے غسل کا بھی خاص اہتمام فرماتے۔ خوشبو کو بہت پسند فرماتے۔ ہمیشہ نہانے کے بعد عطر استعمال کرتے۔ عطریات میں انہیں شامہ العنبر، حنا، نس اور صندل بہت پسند تھے۔ موسم کے لحاظ سے اول الذکر و عطر سردیوں میں اور مؤخر الذکر گرمیوں میں استعمال فرماتے تھے۔ انتہائی نرمی میں پاؤں کا استعمال بھی فرماتے۔

مسواک

مسواک بڑی باقاعدگی سے کرتے تھے۔ بعض اوقات ہر وضو کے وقت مسواک کرنے لگ جاتے۔ کبھی کبھار مسواک مسوڑھوں کو لگا جاتا اور خون بہنے لگتا۔ ہم کہتے۔

ابا جان آپ اس قدر مسواک کرتے ہیں کہ مسوڑھے سے متورم

ہو جاتے ہیں۔

فرماتے ہیں:

”تم نے سنا تو ہو گا حدیث پاک ہے

السِّدَّاقُ مَطَهْرَةٌ لِلْفَمِ مِنْ ضَاآءِ اللَّذِّبِ

مسواک منہ کو پاک کرتی ہے اور رب کو راضی کرتی ہے۔

عرضیکہ وہ سر سے لے کر پاؤں تک طہارت کا پورا پورا خیال فرماتے تھے۔ اللہ پاک

ان کو اجر جزیل عطا فرمائیں۔ آمین

عبادت

آپ ایک انتہائی عابد، زاہد اور متقی انسان تھے۔ میں نے کبھی آج تک

انہیں کسی خوشی، غمی کو عذر رنگت بنا کر عبادت کو چھوڑتے نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی

کسی سے سنا۔ ان کی عبادت کا یہ عالم تھا کہ بہت زیادہ تکلیف میں ہوں، کپڑے

نہ ہو سکتے ہوں۔ بیچہ کر، اشارے سے ہی نماز ادا کر لیتے مگر قضا نہ ہونے دیتے۔

انہیں دردِ گردہ کی تکلیف شدید ایک طویل عرصہ رہی ہے۔ اللہ پاک ان امراض

سے ہم سب کو محفوظ رکھیں۔ جن لوگوں کو اس درد سے سابقہ پڑا ہے وہ جانتے

ہیں کس قدر بے چین کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ درد کی انتہائی تکلیف میں بھی نماز

ادا کرتے تھے۔ تہجد بھی شاید ہی انہوں نے کبھی چھوڑی ہو۔ نماز جمعہ وہ خود اپنی

مسجد کنارہ بازار میں پڑھایا کرتے تھے عیدین بھی کبھی نہ چھوڑتے۔ کلام پاک

کثرت سے پڑھا کرتے۔ صبح و شام کی مسنون دعائیں بھی پڑھا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ انہیں جب بھی وقت میسر آتا تو انفل پڑھتے، سوائے ممنوعہ اوقات کے۔ اکثر و بیشتر میں نے انہیں مصطلے ہی پر دیکھا۔ ان کی عبادت گزار ہی کا یہ عالم تھا کہ آخری طویل بیماری میں وہ وضو نہیں کر سکتے تھے۔ بڑی مشکل سے فتوے حاصل کر کے انہیں تیمم پر رضامند کیا۔ پھر بیٹھ کر ہی نماز ادا فرماتے رہے۔ تہجد آخری دنوں میں بھی نہیں چھوڑی۔ انہیں بہت شدید تکلیف تھی۔ اعصاب میں تھنڈ کے باعث اٹھ بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ یہاں تک کہ مجھ جیسا اتواں انسان پوری طاقت سے انہیں اٹھانہیں سکتا تھا۔ ان کے گھٹنوں کو خم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ صرف ان کے آخری سفر سے صرف تین روز پہلے کی بات ہے۔ رات کے دو بجے مجھے آواز دی فرمانے لگے:

”میں نے نماز کے لیے اٹھنا ہے مجھے بھٹادو۔“

میں ان کی حالت سے بخوبی واقف تھی۔ میں نے عرض کیا کہ:

”آپ بیٹھ کر نماز پڑھ سکیں گے؟“

فرمانے لگے:

”ان شاء اللہ ضرور اٹھ کر نماز پڑھ سکوں گا۔“

میں نے اپنی پوری کوشش کی مگر وہ اٹھ نہ سکے، میں نے لٹا کر ان کے سینے پر تیمم کی سٹی رکھی، تیمم کر دایا، فرمانے لگے:

”چار پانی کا رخ صحیح کر دو۔“

پھر انہوں نے نماز ادا کی۔ اس قدر استقلال تھا نماز کے معاملے میں ان کی طبیعت میں کہ ہاتھ پاؤں ہار چکے تھے مگر عزم و ہمت موجود ہے اور دل زندہ

ہے۔ اللہ پاک کا نام لینے کے لیے زبان قائم تھی۔ ویسے زبان صحیح کام نہیں کرتی تھی۔

خود صابر اوروں کو صبر کی تلقین

کسی جسمانی، روحانی تکلیف پر میں نے ان کو ہائے وائے کرتے نہیں سنا کہ خدا کی ذات سے شکوہ کریں یا لوگوں کی طرح یہ ہی کہیں کہ: ”میں نے ساری عمر دکھوں ہی میں گزار دی، کبھی سکھ نہیں دیکھا۔ اگر کوئی تکلیف آجاتی تو ہمیشہ یہی فرماتے: ”میرے گناہوں کی سزا ہے۔“

بڑے سے بڑا صدمہ دل کو پہنچتا تو خود بھی صبر فرماتے اور دوسروں کو بھی صبر صبر کی تلقین فرماتے چھوٹے بچے فوت ہو جاتے تو یوں دوسروں کو سمجھاتے کہ ”دیکھو نے کر تو وہی گیا ہے جس کا مال تھا۔ آپ کا تو وہ مال نہیں تھا۔ آپ عارضی محافظ تھے۔ اب اگر اس صدمے پر صبر کرو گے تو اجر ملے گا اور نجات کا باعث ہوگا۔ اگر صبر نہیں کرو گے تو گناہ گار ہو گے۔“

پھر اس کو بشارت دیتے کہ:

”صبر کرو گے تو یہی بچہ جس کی جدائی دکھ کا باعث بنی ہے آپ کو پکڑ کر جنت میں ساتھ لے کر جائے گا۔ اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ جب تک والدین کو ساتھ نہ لے جائے۔“

قاری صاحب مرحوم نہایت سلجھی ہوئی طبیعت رکھے تھے مگر قادر مطلق نے ان کی طبیعت میں بڑی لچک رکھی تھی۔ وقت اور حالات کے مطابق اپنی طبیعت کو فوراً بدل لیتے تھے۔ کبھی بذلہ سنج اور ہنسنے ہنسانے کے لیے بن جاتے۔ کبھی کے ساتھ بچوں کی طرح تو تلی باتیں بھی کرتے۔ انہیں خوش رکھے کی ہر ممکن جائز کوشش فرماتے۔ گود میں اٹھا کر پیار کرتے

بڑوں کے ساتھ بڑوں والی باتیں بھی کرتے۔ روتی ہوئی محفل کو منٹوں میں ہنسا دیتے۔ لطیفے سناتے۔ عمدہ عمدہ چٹکلے جو کہ اخلاق سے گرے ہوئے نہ ہوتے سناتے۔ شہر کی ہالٹس کے زمانے میں بڑی عمر کے سناگر داد عزیز رات گئے تک کبھی کبھار محفل گرم کرتے، جہاں حدود شریعت کے اندر ہنسی مذاق کا دور چلتا رہتا۔ اس کے برعکس ہنستی ہوئی محفل کو احکام الہی سنا کر اور ڈرا کر رُلا بھی دیتے۔

خود شاعر تھے۔ فضل تخلص کرتے تھے۔ اقبال، اجامی، اکبر اور غالب ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ مگر ان کی شاعری عشقِ حبیب، عشقِ دیار حبیب تک محدود تھی۔ ان کے کلام کا مجموعہ میرے پاس موجود تھا جو کہ بد قسمتی سے کہیں رکھ کر بھول گئی ہوں۔ بڑا عمدہ اور سادہ کلام تھا، اثر انگیز بھی تھا کہ جنہیں دیار حبیب دیکھنے کی چاہت ہو اگر وہ یہ کلام سن پائیں تو ان کی آرزو میں تیز تر ہونے لگیں اور کانِ اسلام کی پابندی فرماتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حج بیت اللہ کی سعادت بھی نصیب فرمائی تھی۔ صرف ایک دفعہ حج کے لیے تشریف لے گئے تھے ۱۹۵۲ء میں۔ اس کے بعد ان کی تشنگی اور بڑھکتی تھی مگر اتفاق سے

دوبارہ یہ سعادت حاصل نہ کر سکے۔ مدینہ طیبہ اور حجاز میں گزارے ہوئے لذت بخش لمحات اور روح پرور اذاتوں کا کیف و سرور وہ تمام حیات محسوس کرتے اور تڑپ تڑپ کر دوپڑتے۔ بار بار دعا فرماتے کہ :-

”اللہ پاک مجھے بار بار لے جائیں۔ یہاں تک کہ اسی سفر میں میرا

خاتمہ بالخیر ہو جائے“

مگر جیسے اللہ پاک کو منظور۔ ان شاء اللہ ان کی وہ تڑپ اور آرزو رائیگاں نہیں جائے گی۔ اللہ پاک جو کہ بہتر اجر دینے والے ہیں۔ انہیں ضرور اجر دیں گے۔

حجاز، عرب کے قریب کرام کی تلادت وہ بڑے شوق سے سماعت فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ کہیں دور سے کسی ریڈیو پر انہیں عبد الباسط، عبد الصمد صاحب کے پڑھنے کی آواز سنائی دیتی تو فوراً وہ اسٹیشن تلاش فرما کر تلادت سماعت فرماتے۔ یا کوئی اور قاری صاحب پڑھتے ہوئے، آپ گھری غنڈ سے بھی تڑپ کر بیدار ہو جاتے اور کلام پاک سن کر محظوظ ہوتے۔ یہ ان کا کلام پاک الہی سے خاص لگاؤ کا نتیجہ تھا۔

گھر بیٹوں زندگی

قاری صاحب مرحوم نے دو نکاح کیے۔ پہلے نکاح سے کوئی اولاد نہ تھی اور بیوی صاحبہ بھی ایک ڈیڑھ سال زندہ رہ کر قادر حقیقی سے جا ملیں۔ دوسرے نکاح سے ان کے پس ماندگان میں صرف تین بچے ہیں۔ ایک لڑکا قاری انضال الحق اور دو لڑکیاں حلیفہ اور ام کلثوم بقید حیات ہیں۔ ان کا اپنے گھر والوں سے ساری عمر اتنا اچھا سلوک رہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کے اتباع کی حتی الامکان پوری کوشش فرماتے۔ اللہ تعالیٰ انہیں
جزائے خیر دیں۔ آمین۔

انہوں نے اپنی اولاد کو دنیوی تعلیم کی بجائے دینی تعلیم دلانا اپنا فرض سمجھا۔ نماز
پنجگانہ پابندی سے شروع میں پڑھوایا کرتے تھے۔ اور بچپن ہی میں عادت ڈالتے
تھے جب بچے اور سب گھر والے پنجگانہ نماز پڑھنے لگ گئے تو وہ مطمئن ہو گئے
کلام پاک خود اپنے بچوں کو پڑھایا۔ اس کی روزانہ عادت ڈالنے کے لیے صبح بلا
ناغہ خود سماعت فرمایا کرتے تھے۔ صبح کے وقت روزانہ منزل کے علاوہ سورہ
یسین بھی پابندی سے پڑھنے کی عادت ڈالی۔ جمعۃ المبارک کے دن سورہ کہف
کی پابندی کی بھی عادت ڈالی۔

بھائی قاری افضل الحق صاحب کو سند یافتہ قاری بنایا اور دیگر دینی علوم
سے بھی ردشناس کرایا تاکہ قیامت کے روز وہ سرخرو ہو سکیں۔ وہ لاڈلی
طبیعت کے مالک تھے۔ کسی روز طبیعت تساہل پر آرائی تو شرارتا کہتے :-
”اباجان! آج سنانے کی چھٹی“

اپ لاڈ سے سمجھاتے :-

”بلیا! مجھ تو اس دنیا میں جو کچھ ملا ہے کلام پاک کی بدولت

ملا ہے اس کا ناغہ نہ کیا کر۔“

وہ کلام پاک پڑھ کر بیٹھے ہی ہوتے اور مذاق میں یہ بات کہہ دیتے تھے۔ اباجی
کے فرمان کے ساتھ ہی کلام پاک سنانا شروع کر دیتے تو اباجان معصوم بچوں
اطرح خوش ہو کر بیٹے کی بیٹھ پر پیار سے تھپکیاں دیتے اور اس کو لاکھوں

دعائیں دیتے۔ روزانہ کی عادت نچتہ کرنے کے لیے ان کی بھی روزانہ منزل سنا کرتے

قاری افضل الحق صاحب حافظ کلام پاک بھی ہیں۔ آخری تین سالوں میں

جبکہ قاری صاحب مرحوم نقاہت کے باعث کسی مسجد میں جا کر نماز تراویح پڑھنے

سے معذور ہو گئے تھے تو گھر پر ہی افضل صاحب کی سماعت فرمایا کرتے تھے

محترم قاری صاحب اپنی زندگی میں اعزہ کے ساتھ نہایت حسن سلوک سے

رہے۔ اعزہ کی وفات کے بعد بھی سچی قرابت داری نہایت حسن و خوبی کے

ساتھ بناہتے رہے۔ ان کے لیے کلام پاک پڑھو پڑھو کر اور فی سبیل اللہ اثر

عزبار میں بانٹ کر انہیں ایصالِ ثواب کرتے رہے۔

قربانی بڑے اہتمام سے کرتے تھے۔ اعزہ کی طرف سے بھی قربانی کرتے

رہتے اور رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے بھی قربانی دیتے تھے۔

میرے لیے وہ نہ صرف سفیق باپ تھے بلکہ میرے محسن اور مکرم استاد

تھے۔ انہیں کسو کہ ہم نے بہت کچھ کھویا ہے۔ اللہ پاک انہیں عزیزی رحمت

فرمادیں اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ اور ان کی

اولاد میں ان کا نام باقی رکھیں۔ آمین یا اللہ العالمین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ

قاری افضال الحق صاحب

مولانا قاری خدابخش صاحب فرماتے ہیں :-

”مجھے آنا معلوم ہے کہ میں ۱۹۱۰ء میں امرتسر آیا۔ یہاں اس وقت قرآن مجید کا کوئی مدرسہ نہ تھا۔ موری گنج شیخ بوڑھے کی مسجد میں مولانا نور احمد صاحب قدس سرہ کی خدمت میں گیا۔ میں مولانا سے ایک ایک آیت پوچھ کر یاد کرتا رہا۔ اس وقت قاری فضل کریم صاحب سات آٹھ سال کے ہوں گے۔ میرے پاس آکر پڑھتے رہے۔ آٹھ دس پارے مجھ سے پڑھے۔ قاری صاحب کی والدہ شامانی تھیں وہ خورد و نوش میں انہیں تنگ رکھتیں۔ بسا اوقات خورد و نوش کا ناغہ ہو جاتا۔ قاری صاحب مدرسہ ہی میں رہتے تھے۔ آپ کے والد صاحب آپ کے کھانے پینے کا بند و بست کرتے تھے۔

مولانا قاری خدابخش صاحب، قصبہ کانٹھ ضلع مراد آباد کے رہنے والے ہیں۔ الحمد للہ بقید حیات ہیں۔ حضرت قاری صاحب کے اساتذہ میں سے ہیں۔

امرتسر میں تجوید و قرارت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ میں تجوید حاصل کرنے کے لیے لکھنؤ چلا گیا۔ میرے بعد مولانا نور احمد صاحب نے کھانے کا انتظام کر دیا۔ میں لکھنؤ سے قاری کریم بخش کو امرتسر لے آیا تھا۔ قاری کریم بخش نے امرتسر پڑھانا شروع کر دیا اور میں خود دوبارہ سب سے پڑھنے کے لیے لکھنؤ چلا گیا۔ قاری فضل کریم صاحب حافظ عبداللطیف سنبھلی (جو مسجد خیر الدین میں پڑھاتے تھے) کے پاس چلے گئے اور غالباً قرآن مجید بھی ان ہی کے پاس پورا کیا اور تجوید کی کتابیں قاری کریم بخش سے پڑھیں۔ اس کے بعد قاری صاحب لاہور آگئے اور مال روڈ پر ڈاکٹر عزیز الدین کے ہاں پڑھاتے رہے۔ اس کے بعد ضلع گورداسپور میں بھی کسی کے ہمراہ گئے اور کچھ مدت وہاں رہے۔ اس کے بعد مسجد چنیاوالی لاہور میں تقریباً ۲۰ سال پڑھایا۔ وہاں سے علیحدہ ہو کر موتی بازار مسجد نور میں مدرسہ تجوید القرآن کی بنیاد رکھی۔

میرے ابا جان محترم قاری فضل کریم صاحب کی طبیعت مال و دولت کی ہوس سے عاری تھی۔ ایک واقعہ عرض کروں جو کہ نوعیت کے اعتبار سے معمولی سا ہے مگر ان کی فیاضی کی یقیناً صحیح عکاسی کرتا ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ ایک لڑکی جو کہ سراج الدین صراف کی کی تو اسی تھی ان کی صرافہ کی دکان کشمیری بازار میں ہے۔ ہماری اس بن صاحبہ کا اسم شریف باجی کوکب ہے۔ انہوں نے ابا جان سے کلام پاک پڑھا ہے۔ باجی کوکب نے

نہایت کم عمری میں کلام پاک ختم کیا تھا۔ خدا معلوم کہ کم گو تھیں یا ویسے ہی شرمیلی طبیعت کی مالک تھیں۔ بہت کم بولا کرتی تھیں۔ کلام پاک ختم کے موقع پر انہوں نے ایک ہزار کی خطیر رقم اباجان کے حضور پیش کی مگر منہ سے کچھ نہ کہا۔ عام طور پر شہر میں رواج تھا کہ کلام پاک کے ختم پر طالب علم کے والدین سمٹھائی بھینتے اباجان اور دیگر گھر والوں کے کپڑے وغیرہ بنا کر دیا کرتے تھے۔ انہوں نے نہ تو شیرینی بانٹی اور نہ ہی کوئی اور رسم ادا کی۔ بس سچی نے رقم اباجان کے حوالے کر دی۔ ساتھ ہی ان کے نانا صاحب نے چار ہزار روپے اباجان کے ہاتھ۔

تھکا دیے۔ انہوں نے بھی کچھ نہ فرمایا۔

یہ تقریباً ۱۹۵۵ء کا ذکر ہے۔ انہی دنوں مدرسہ تجوید القرآن کی پرانی عمارت منہدم کر کے از سر نو تعمیر کیا جا رہا تھا۔ منجیر حضرات تعمیر کے کام میں گرم جوشی سے حصہ لے رہے تھے۔ اباجان نے یہ رقم اپنے پاس نہیں رکھی حالانکہ جب وہ یہ رقم دے کر گئے تھے، اس وقت باجی کو کب، ان کے نانا جان اور میرے اباجان کے علاوہ چوتھا کوئی شخص موجود نہ تھا۔ وہ چاہتے تو کسی دوسرے کے ساتھ اس رقم کا ذکر تک نہ کرتے نہ ہم خود کرایہ کے مکان میں رہتے تھے مگر ان کی بے غرض طبیعت نے اس بات کو گوارا نہ کیا۔ بے چون و چرا وہ رقم مدرسہ کے فنڈ میں جمع کر دیا کے مبلغ پانچ ہزار کی رسید ان کے حوالے کر دی۔ گھر والوں نے پوچھا کہ وہ مدرسہ کے لیے دے کر گئے تھے؟ فرمانے لگے کہ:

”انہوں نے رقم دیتے وقت کچھ کہا نہیں تھا۔ ویسے بھی مدرسہ

کو اس وقت پیسے کی اشد ضرورت ہے۔ دینی ضرورت کا پورا ہونا
 بہت ضروری ہے۔ دنیاوی ضرورتیں تو اللہ پاک پوری کر ہی رہے
 ہیں۔

اللہ پاک جس کو چاہیں عزتوں سے نوازتے ہیں۔ ابا جان مرحوم باوجود
 غریب، معذور ہونے کے دینی حلقوں میں بہت مقبول تھے۔ یہ اللہ پاک
 کا خاص فضل و کرم تھا۔ دنیا دار بھی انہیں قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔
 بعض حاسد طبیعتیں کسی کا عروج دیکھ نہیں سکتیں اور اذیت کے درپے رہتی
 ہیں۔ ابا جان کے ساتھ بھی اکثر یہی کچھ ہوتا رہتا تھا۔ ان کے ہم مشرب دگ
 ہی ان سے ٹھار کھاتے مگر یہ اپنی متواضع طبیعت کے باعث کسی سے جنگ
 نہیں کرتے تھے، بلکہ ہمیشہ دوسروں کا بھلا ہی سوچتے اور کرتے تھے۔ مگر وہ
 خواہ مخواہ لڑنے جھگڑنے پر تل آتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ابا جان نے اپنے کسی مدرسے میں اپنے ایک شاگرد
 کو وہاں کے مدرس کے پاس۔۔۔ کام کی عرض سے بھیجا۔ اپنا کام کرنے کے بعد
 وہ شاگرد واپس آگیا مگر وہاں کے مدرس بہت برا نیگینہ ہوتے اور انہوں نے الزام
 لگایا کہ آپ کا شاگرد میرے شاگردوں کو درغلا کر آپ کے مدرسے لانا چاہتا
 تھا۔ آپ نے جس طالب علم کو بھیجا تھا اسے بلا کر حقیقت حال دریافت فرمائی
 اس نے حلفیہ بیان دیا کہ میں نے کسی طالب علم سے بات کرنا تو درکنار، آنکھ
 اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ آپ اسی شاگرد کو ساتھ لے کر اس مدرسے میں گئے،
 طالب علموں سے دریافت کیا۔ کسی سے کوئی بات کی ہوتی تو کوئی کہتا۔ مگر مدرس

صاحب بصد تھے کہ نہیں اس نے ورغلا یا ہے۔ ابا جان نے خود اس شاگرد سے بھی معافی منگوائی کہ بچے نے اگر کوئی بات کی ہے تو غلطی کی ہے۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔ یہ تھی ان کی طبیعت کہ بغیر قصور کے معافی مانگ کر بات کو ختم کر دیتے تھے اور لڑائی جھگڑے سے سخت نفرت کرتے تھے۔

خود استاد تھے مگر اپنی اولاد کے اساتذہ اور دیگر اساتذہ کرام کے وقار بہت خیال فرماتے تھے۔ ایک واقعہ عرض کر دوں۔

میر ہی چھوٹی باجی نے ابتدائی تعلیم مسجد چینیوالی کے ملحقہ سکول میں حاصل کی۔ جس کا نام ”مدرسہ بنات المسلمین“ ہے۔ وہاں اس زمانہ میں کلام پاک کی تعلیم کے لیے لائق قرار کراہے متعین تھے۔ جن طالبات کلام پاک پڑھا کرتی تھیں۔ طالبات کی زیادہ تعداد کے پیش نظر ہر کلاس کو دو دو فریق میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک فریق کے استاد محترم کا اسم شریف تھا قاری دل محمد صاحب اور دوسرے بزرگوار قاری بہاری صاحب تھے۔ قاری بہاری صاحب عمر رسیدہ بزرگ تھے اور قاری دل محمد صاحب نو عمر تھے۔ قاری بہاری صاحب سے لڑکیاں ذرا کم ہی دہتی تھیں۔ ایک دفعہ قاری دل محمد صاحب چھٹی پر تھے اور ان کی کلاس بھی قاری بہاری صاحب کے ذمہ تھی۔ لڑکیوں نے ان کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ایک لڑکی ذرا زیادہ ہی گستاخ طبیعت تھی۔ ان دنوں مولیٰ کی سبزی کے دن تھے۔ لڑکی ایک بڑی ساری مولیٰ لے آئی اور لاکے قاری بہاری صاحب کو دکھا کر پوچھنے لگی :-

”قاری صاحب مولا کھانا لے“

وہ آگ بگولا ہو گئے۔ سچی کو پکڑنے دوڑے تو وہ بھاگ گئی۔ دوسرے دن قاری
 دل محمد صاحب قشرف لائے تو انہوں نے شکایت کی۔ قاری دل محمد صاحب
 نے میری باجی کو چولہے کی راکھ لاکر اس گستاخ لڑکی کے منہ میں ڈالنے کو کہا
 باجی ان سے حکم کے ساتھ اٹھ تو کھڑی ہوئی۔ مگر کچھ تذبذب میں پڑ گئی۔ قاری
 صاحب موصوف نے دریافت فرمایا کہ تم اس کے منہ پر راکھ کیوں نہیں ڈال
 رہی۔ باجی نے کہا۔ یہ باہر جا کر مجھے مارے گی۔ وہ فرمانے لگے اس کی مار کا ڈر
 ہے میری مار کا ڈر نہیں۔ اس لڑکی کے منہ میں انہوں نے خود راکھ ڈالی اور
 باجی کے منہ پر ایک شدید پتھر رسید کیا۔ باجی تو ازل برقرار نہ رکھ سکیں،
 کلام پاک رکھنے کی چوکیوں کے ساتھ ان کا سر ٹکرایا اور پھٹ گیا۔ خون کے
 فوارے ابل پڑے۔ مرہم پٹی کے لیے باجی کو بھیجا گیا۔ صورت حال کا صحیح علم جب
 ابا جان کو ہوا تو وہ اٹھا باجی کو ناراض ہوئے کہ:

”تم نے کہا کیوں نہیں مانا تھا۔ جاؤ اب جا کر معافی مانگو۔“
 باجی کہنے لگیں:

”انہوں نے میرا سر کھپوڑا ہے میں نے ان سے نہیں پڑھنا۔“
 فرمانے لگے:

”تمہاری غلطی کی سزا ملی ہے۔ معافی مانگو۔ اگر معافی مل جائے
 تو تم ہماری بیٹی ہو گھر آ جانا۔ اگر معافی نہ مانگو یا معافی نہ ملے تو گھر
 نہ آنا۔“

ساتھ ہی اپنے ایک شاگرد کو بھیج کر معافی منگوائی اور یوں دوسرے استاد

اوتار قائم رکھا۔

ٹوٹ کھجانے سے احتراز

قاری نذیر صاحب زاوی نہیں کہہ۔

”مجلس ابنائے قدیم کے بعض رفقاء نے قاری صاحب مرحوم سے بطور یادگار فوٹو کھجانے کی درخواست کی۔ مگر قاری صاحب نے سختی سے منع فرمادیا۔“

”ایک دفعہ حافظ رمضان الحسن (جو کہ حضرت قاری صاحب کے شاگرد تھے) کی شادی کے موقع پر فوٹو گرافر کا انتظام کیا گیا۔ حافظ رمضان صاحب کا نکاح حضرت قاری صاحب ہی نے پڑھانا تھا۔ فوٹو گرافر صبح کیمرا لائے تھے، مگر خدا کی قدرت پوری کوشش کے باوجود وہ حضرت قاری صاحب کا فوٹو اتارنے میں ناکام رہے۔“

”ایک دفعہ رات کو بستر پر گئے تو فرمانے لگے: مجھے ایک شیر بار بار کھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بہت پریشانی ہوئی کہ آخر بات کیا ہے۔ تلاش کے بعد معلوم ہوا کہ ایک ٹیبل لیمنٹ پر شیر کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ یہ تصویر شادی گئی۔ تب تیند آئی۔“

حضرت قاری صاحب نے اپنی ساری زندگی قرآن مجید کی خدمت کے لیے وقف کر دی اور جہاں تک ہو سکا سنت نبوی کے تابع رہے۔ حق تعالیٰ مغفرت

فرمائیں۔ اور آپ کے درجات بلند فرمائیں۔ آمین۔

ہیبا تقبل منا انک انت السميع العليم
وتب علينا انک انت التواب الرحيم

(یہ مضمون قاری انصالحق صاحب کا ہے۔ آپ حضرت قاری صاحب کے
فرزند ارجمند ہیں۔)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

يا استاذي

حافظ قاري عبد الباقى ابيث ابادى مدرس حال سعودى عرب

حفظت القرآن الكريم بمدينة كاهور في باكستان الغربية
 لم يسهلها الشيخ المقرئ فضل كبريم بن اقبال احمد اكرتسرى
 رحمه الله عليه وتقع هذه المدرسة في موقع طيب وتتالف من
 طابقين علوي وسفلي ولها ساحة وسيرة وحجرات كثيرة و
 مساكن للطلبة والمدرسين.

كلما يدخل فيها المؤمن يفرح قلبه ■ يشرح صدره لما
 يسمع من اصوات ترتيل القرآن الكريم المجددة كأنها من امين
 واود عليه السلام ولا يسمع فيها اصوات القرآن ولا يرى
 فيها احاطات العلم والذكر والقوان.

يخزن المؤمن على فراق هذه الحلقات الطيبة وان منظم
 هؤلاء الطلاب الصغار حفاظ لكتاب الله عز وجل يبهج و
 يسر كل من سراه من في قلبه مثقال ذرة من الايمان ويدخل
 الرهبة والكابة في قلوب المنافقين لما جبل عليه هؤلاء الصغار
 من اخلاقه حسنة ساحتهم وسعافظ على الصلوة وغيره على

الدين و نذر انفسهم لنشرة و حمايته و تدرس فيها الطلبة
من ابناء المدينة كاهورا وغيرهم الذين يتركون اوطانهم
واهلهم ويتحملون مشاق السفر في طلب العلم من بلدان
شتى و من قبائل شتى و تدرس هذه الطلبة الدين عند اهل
الحق الذين يبلغون الحق والدين الاسلامي الذي جاء به
الرسول محمد صلى الله عليه وسلم لا يريدون جناء ولا تسكورا
و يؤدون واجباته بشكل منظم ولا يخافون في الله فومة كما
يمبرون على ايداعهم اولى الامس و من اعداء الاسلام و
اما المدارس الحكومية الرسمية فانها خالية من الهدى و
مليئة بالفسادات التي عن سرها فيها الا نجلين عدو الاسلام
الدور و في زمن حكم الا نجلين و تسلطه على الهند قامت
طائفة من اهل الحق بستان دينهم و اعتنت به و رعته
بانشاء المدارس الاهلية الاسلامية فغضب الا نجلين
الكانر و اغلق المدارس الدينية في اواغل استعمارها و
انتج الجامعات المختلطة للمسلمين و للهندوكيين و للمسيحيين
و لكن بفضل الله عز وجل و بعونه جاء الحق و نزلت
الباطل ان الباطل كان زهوقا نصر اهل الحق و الاسلام
قتو فيقه و فتحت اعداد كبيرة من المدارس الدينية الاهلية
على حساب اهل الخير و هذه المدرسة فرع من هذه

المدارس الإسلامية.

مرخص لي أبي رحمه الله تعالى في السفر لتعليم الدين إلى مدينة كاهور و تصلحت فيها سنوات بعد انتهاء من الميترك وكان مديري هذه المدرسة رجلاً فاقداً للبصر وهو الشيخ المقرئ فقل كر يم رحمه الله عليه وحفظت القرآن الكريم على يديه وكنت أكتب له الرسائل واستمع له لأنه كان لا ينطق وكنت أقودها إلى البيت والمدرسة والسوقه و افتخر بخدمته.

عندما ذهبت إليه لتطلب العلم كان قد بلغ عليه الستين تقريباً من عمره ولكنه لا يزال مثل الشاب النشط وكانت صحته جيدة لم تسقط له سن وكان جميل الصوت يسبح الإنسان من صوته كلما ينزل القرآن كما يتصنع ولا يلحن فيه وكان يمازح الطلبة ويدخل السرور على قلوبهم وكان خطيباً في مسجد الجامع من جامعان كاهور وكان يخطب أحياناً في المحاضرات الدينية و زاد الله في العلم والجسم وإذا كان الإنسان كما يعرف أنه كفيف البصر أم كان قوي الصوت تخاف الطلبة والمدرسين منه.

وكان يلقب المدرسين والطلبة ويختمهم على الإجهاد وكان يدور في الليل على مساكن الطلبة يسدحوا أجهم و

يفرّ بين اخلاء قههم وكان عادلا اذا تنازع طالبان او
 مدرسان في شيء كان يحكم بينهم بالعدل و اذا اخطأ
 في حكمه مرجع و طلب السماح من المظلم
 و الله اذكر الاجيام التي قضيت معه و ابكى على فراقه و
 ترك من اولاده ابن الحافظ افضل الحق و بنتان و مات
 في عام ١٢٩٠ هـ ارجو من الله عز و جل ان يجعل الجنة
 مثواه و الخلود فيها و ان يغفر له و يوحه و يجمعنا
 على حوض نبيه محمد عليه افضل الصلوة و السلام في جنات
 الخلود و الحمد لله رب العالمين

حافظ قاری فضل کریم صاحب

احمد خالد عمر صاحب بی اے آرزو، ایم اے علیگڑھ یونیورسٹی سندھ مسلم کالج کراچی

یہ بات کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
(اقبال) قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن

حافظ صاحب سے ملاقات کاشرت مجھے بس بیس سال قبل حاصل ہوا
جب میں اپر سند کالونی، کراچی میں محمد یوسف سیٹھی صاحب کے مکان کے منتقل
اوپر والے فلیٹ میں کرایہ دار تھا۔ سیٹھی صاحب کے مکان تھے اور مدارس کے
قیام میں دن رات کوشاں رہتے تھے۔ حافظ صاحب ان کے قدیم دوست تھے
اور رمضان میں تراویح میں قرآن مجید سنانے کے لیے سیٹھی صاحب کے وہ مہمان
رہتے تھے۔ حافظ صاحب نابینا تھے اس لیے ان کا ایک شاگرد، ان کی خدمت کے
لیے ان کے ساتھ لاہور سے آیا تھا۔ اس طرح چند رمضانوں میں میں نے سیٹھی
صاحب کے گھر پر نمازِ عشر اور تراویح میں شرکت کی۔ ۵۸ء میں مکان چھوڑنا
پڑا کیونکہ مالک مکان تبدیل ہو گیا تھا اور نئے مالک نے اپنی ضرورت ظاہر کر کے
خالی کرایا۔ اگر چند سال عدالت میں صرف نہ کیے جاتے تو مکان پہلے ہی خالی کر دینا

پڑتا۔ پھر اس کے بعد حافظ صاحب اپنے جلسوں بول کے مرض میں وجہ سے ضعیف ہو گئے تھے اور کراچی نہیں آتے تھے۔ ایک

ایک مرتبہ لاہور میں ان کے گھر پر بھی ملاقات کا موقع ملا حافظ صاحب بہت زیادہ تخلیق اور طنسار تھے اور صرف میر نے سلام کرنے کی آواز سے مجھے پہچان لیا کرتے تھے۔ لیکن حافظ صاحب کی سب سے بڑی خوبی جس نے مجھے بہت متاثر کیا وہ ان کا طرزِ ترتیلِ قرآن تھا۔ ہر لفظ اچھی طرح ادا ہوتا تھا۔ ثواب بیان کرنے والی آیتوں کے موقع پر انبساطِ ظاہر ہوتا تھا اور عذاب بیان کرنے والی آیتوں کے وقت گہرا ہٹ ظاہر ہوتی تھی۔ احکام بیان کرنے والی آیتیں زور اور تاکید کے ساتھ ادا ہوتی تھیں۔ یہ سارا لطف میرے لیے خصوصی لذت رکھتا تھا کیونکہ میں ہر آیت کا ترجمہ سمجھتا جاتا تھا اور یوں پورے قرآن کے مطالب ایک ہی ماہ میں تازہ ہو جاتے تھے ویسے میرا معمول ایک رکوع روزانہ کا ہے جو اللہ کے فضل و کرم سے سال بھر جاری رہتا ہے اور یہ عادت، تیس سال سے زائد عرصہ سے قائم ہے یعنی اسکول کے آخری درجوں کے زمانہ سے۔ والد صاحب بھی ہر سال حافظ صاحب سے ملاقات کرتے تھے اور اپنے مکان ہی میں بیٹھ کر ان کی اقتدا تراویح میں کرتے تھے کیونکہ ٹانگوں پر اپنی تکلیف تھی۔ والد صاحب کی وفات کو تقریباً دو سال ہو گئے۔ قرآن فہمی کا یہ شوق مجھے ان ہی سے ملا تھا اور ان کا زندگی بھر یہی معمول رہا کہ قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھیں اور اسی کے مطابق عمل بھی کریں، اور مضامین بھی لکھیں۔ وہ فرماتے تھے کہ بغیر سمجھ پڑھنے سے حق تلاوت ادا ہو ہی نہیں سکتا۔ الَّذِينَ اَتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ ط

حافظ صاحب کے سینکڑوں شاگرد و ماشار اللہ حافظ اور قاری بن چکے ہیں۔ مدرسوں میں پڑھا رہے ہیں۔ قرآن سنا رہے ہیں اور بعض تو مدرسے چلا رہے ہیں۔ ان کے ہر شاگرد میں تریل کی وہی صفت پائی جاتی ہے صرف استاد اور شاگرد کا فرق ہے۔ میں ان کے دو تین شاگردوں سے بھی قرآن سن چکا ہوں، بہ سہولت مجھے ترجمہ سمجھنے کا لطف آتا رہا۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس خصوصی کام کو زیادہ سے زیادہ بڑھائے اور سارے ملک میں پھیلا دے۔

اللہم ناد فزد۔

اگر اسی طرح ہر حافظ رمضان میں قرآن مجید سنائے اور لوگوں کو قرآن مجید کو ترجمہ کے ساتھ پڑھنے کی اہمیت کا علم بھی ہو جائے تو ہر مسجد میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہی زیادہ بڑھ جائے گی جو پڑھے لکھے تو کہلاتے ہیں، لیکن قرآن مجید کے علاوہ ہر کتاب کو سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ عربی زبان نہ جاننے کا عذر ہرگز معقول نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر زبان میں مستند ترجمے موجود ہیں اور متن کے ساتھ ترجمہ بھی پڑھنے کو اگر معمول بنالیا جائے تو خود بخود مقوڑھی بہت عربی آ جاتی ہے اور عربی ذاتی بڑھتی بھی جاتی ہے۔ اور یہ بھی قرآن کریم کا ایک معجزہ ہے۔ تراویح میں شرکت تو میں نے برسوں کی ہے لیکن جو لطف اور استفادہ حافظ صاحب کی قیادت میں حاصل ہوا وہ اپنی مثال آپ ہے۔

اللہم اغفر له و ارحمه انه عبدك و انه كان يتلو
کتابك حق تكل و تہ

نوٹ :-

ایک اور بات بھی حافظ صاحب کے متعلق یاد آئی جس سے ان کی گہری قرآن فہمی اور اسلامیت کا پتہ چلتا ہے اور جو آج کل بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ "جلس بول" کے مرض کی وجہ سے وہ متفکر اور پریشانی رہتے تھے اور پریشانی کی خصوصی وجہ انہوں نے یہ فرمائی تھی کہ :-

"اس کے علاج کے سلسلہ میں بے ستری ہوتی ہے۔"

ان کے اس تبصرہ نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان میں یہی احساس جیا پیدا کر دے اور ہر مسلمان کو ہر مرض سے اور ایسے ہر علاج سے محفوظ رکھے

آمین ثم آمین یا اللہ العالمین

ہمنا تقبل منا انک انت السميع العليم

وتب علينا انک انت التواب الرحيم

یادِ اَسْتَاذِ الْمَلْکَمِ

قاری محمد اقبال صاحب

استاذنا المحترم و مخدومنا المکرم حضرت قاری فضل کریم صاحب کی خدمت میں جب میں حاضر ہوا تو کچھ پارے پہلے سے مجھے یاد تھے، صرف آخری پارے باقی تھے وہ حضرت قاری صاحب ہی سے یاد کیے اور منزل تقریباً دو سال تک سنا تا رہا اس لیے گویا سارا قرآن مجید قاری صاحب ہی نے مجھے پڑھایا۔ میری تعلیم کے دوران ایک دفعہ والد ماجد صاحب تشریف لائے، تو قاری صاحب نے ان سے فرمایا:

”اس بچے کو تو قرآن مجید کے لیے وقف کر دیں۔“

چنانچہ حفظ کے بعد حضرت قاری صاحب کے ارشاد کے مطابق درجہ تجوید میں داخلے لیا۔

روایتِ حفص کے بعد مجھ پر خصوصی شفقت فرماتے ہوئے، اپنے ساتھ مجھے معین مدرس رکھ لیا۔ اس خدمت کا شرف مجھے ایک سال تک حاصل رہا پھر مجھے روایاتِ سبعہ کا خیال دامن گیر ہوا تو حضرت نے کمال شفقت سے مجھے شاطبیہ کا اردو شرح عنایاتِ رحمانی تین جلدیے مکمل مرحمت فرمایا۔ جب میں سبعہ سے فارغ ہوا تو آپ سے مشورہ لیا۔ میں نے آپ کے

مشورہ کے مطابق کتبِ درسِ نظامی شروع کر دیں۔ اس دوران وقتاً فوقتاً ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ بعض اوقات مجھ سے آپ قرآن مجید سنتے اور خوش ہونے نیز اس سلسلہ کو جاری رکھنے کی تلقین فرماتے۔

میں کچھ عرصہ دارالقرآن ماڈل ٹاؤن لاہور میں حضرت مولانا قاری محمد شریف صاحب کے پاس بھی معین مدرس رہا ہوں۔ ان ایام میں جب زیارت کے لیے حاضر ہوتا تو مسائلِ تجوید پر گفتگو فرماتے۔ بعض اوقات میں ان سے مرحوب ہو کر رک جاتا تو فرماتے "جواب نہیں دیتے ہو" غالباً آپ شوقِ درخبت بڑھانے کی خاطر تجوید کے مسائل دریافت فرماتے تھے۔

آپ شاگردوں پر کڑی نگرانی رکھتے تھے۔ تراویح میں بعض اوقات بغیر اطلاع آجاتے۔ قرآن مجید سنتے اور مناسب ہدایات دے دیا کرتے تھے۔ پچاسچہ میں ایک دفعہ کشمیری بازار کی ایک مسجد میں قرآن مجید سنارہا تھا۔ آپ تشریف لائے اور کچھ دیر سن کر چلے گئے۔ مجھے صبح اس وقت علم ہوا جب آپ نے خود اظہار فرمایا۔ پھر آپ نے چند مفید نصیحتوں سے بھی نوازا۔

ایک دفعہ میں حضرت مولانا محمد اجمل صاحب کے ہاں، مسجد رحمانیہ قلعہ گوجرانگہ لاہور میں قرآن مجید سنارہا تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر جب میں مسجد کے صحن میں آیا تو حضرت قاری صاحب صحن میں موجود تھے۔ مجھے اس جگہ نمازیوں کے سامنے ڈانٹتے ہوئے فرمایا:

"تیز منت پڑھا کر د اور رکوع میں کم از کم تین دفعہ آہستہ آہستہ تسبیح کہا کرو"

جب میرا تقرر راولپنڈی مدرسہ تعلیم القرآن راجہ بازار میں ہوا، تو ایک دفعہ لاہور گیا، قاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ چاہتے تھے کہ آپ کے شاگرد پڑھنے کے بعد قرآن مجید کی خدمت کریں۔ آپ اس کام سے بہت خوش ہوئے اور دعائیں دیں۔

آپ وجیہ، پارعب اور بہترین منتظم تھے۔ معذور ہونے کے باوجود پورے مدرسہ پر آپ کا مکمل کنٹرول تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بڑے اور چھوٹے سب اپنے اپنے کام میں تندی سے مشغول رہتے تھے۔

طبیعت میں عاجزی اور انکساری تھی۔ خوش مزاج، خوش مزاج اور ملنسار تھے۔ اوقات تعلیم کے علاوہ طلباء کے ساتھ خوش طبعی بھی فرماتے۔ آپ طلباء سے بے حد محبت کرتے اور طلباء بھی پر دانوں کی طرح آپ کے ارد گرد جمع رہتے۔

ہمارے ملک میں جہاں تک ہمیں معلوم ہے، لوگ قرأت و تجوید سے بالکل نا آشنا تھے۔ قاری صاحب نے اس فن کو وہ فروغ دیا کہ مجویدین حفاظ کی تلاوت سے، اللہ کی مساجد گونجنے لگیں۔ قاری صاحب کی تلاوت سے متاثر ہو کر بہت سے لوگوں نے اپنے بچوں کو حفظ کرانا شروع کر دیا بلکہ میں سچ کہتا ہوں کہ حضرت قاری صاحب کے شاگرد و حفاظ جہاں کہیں پڑھتے تھے لوگ عیش عیش کر اٹھتے، اور اپنے بچوں کو حضرت قاری صاحب کے سپرد کر دیتے۔ آپ کی اس قدر شہرت ہوئی کہ ملک کے گوشے گوشے سے طلباء قاری صاحب کے پاس موٹی بازار آنے لگے۔ یہ طلباء قرآنی موتیوں سے جھولیاں

بھر کر اپنے شہروں میں واپس جاتے اور لوگوں کو کتاب الہی اسی طرح تجوید کے
ساتھ پڑھاتے تھے۔

جن طلباء نے آپ سے براہ راست پڑھا وہ بھی شمار سے باہر ہیں اور پھر
جو آپ کے شاگردوں کے شاگرد ہیں اور آئندہ قیامت ان شاء اللہ یہ سلسلہ
جاری رہے گا۔ ان سب کا حد و حساب اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ ایک
محدود کو اللہ تعالیٰ نے قرآنی خدمات کی وہ توفیق بخشی جس سے لاکھوں دنیا
محروم ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ اپنے زور بازو کی بات نہیں۔ ذلک
فضل اللہ یہ تہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم ہے

این سعادت بزور بازو نیست

تا بخشند خدائے بخشنده!

پس قاری صاحب اگر یہ ہم سے جدا ہو گئے ہیں لیکن ان کامیاب
بفضلہ تعالیٰ زندہ ہے۔ ہماری دعا ہے کہ آپ کی تربیت بقعہ نور بنی رہے
اور قیامت تک اس پر خدا کی رحمتیں عظیم عظیم برستی رہیں۔ حق تعالیٰ حضرت الانسار
کو ہماری طرف سے جزا بخیر دیں۔ آپ کو جنات عدن نصیب فرمائیں۔ آپ
کے درجات حق تعالیٰ بڑھاتے جائیں اور اس کا آپ کو حقیقی مصداق
بنائیں کہ پڑھتے جائیں اور اعلیٰ مراتب پر چڑھتے جائیں۔
ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی
توفیق نصیب فرمائیں۔ آمین۔

حضرت قاری صاحب کے بارے میں چند تاثرات

از: حافظ قاری فیوض الرحمن ایم اے (عربی علوم اسلامیہ، اردو، فارسی)
 مدرسہ شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
 نَحْمَدُہٗ لَا وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

قاری صاحب سے پہلی ملاقات

۱۹۵۴ء کے رمضان المبارک، ۲۷ ویں شب کی بات ہے کہ شبلیہ میں حضرت قاری صاحب کے ایک شاگرد حافظ قاری محمد سلیم صاحب (کراچی والے) کی تلاوت سے متاثر ہو کر ۲۰/۵/۵۶ء کو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور قرآن کریم حفظ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ آپ نے بجا مالِ شفقت مجھے اپنی شاگردی میں لے لیا۔ حفظ کے پہلے سال کا امتحان حضرت قاری صاحب کے استاذ جناب حافظ قاری کریم بخش صاحب نے لیا تھا۔ انہوں نے قاری صاحب کی موجودگی میں کئی ایک مقامات مجھ سے سنے اور مجھے ”قابلِ انعام“ لکھا۔ اسی طرح دوسرے سال اور پھر تیسرے سال برابر ”قابلِ انعام“ لکھتے رہے۔ حضرت قاری صاحب نے پہلے سال کے امتحان کے بعد میرا ”قابلیت“ وظیفہ ”مقرر فرمایا، مجھ سے پہلے پورے مدرسہ شاید دو تین طالب علموں کو یہ وظیفہ ملتا تھا۔ ایک کراچی کے ستاری

محمد سلیم صاحب تھے اور دوسرے مظفر آباد کے حافظ قاری خلیل الرحمن صاحب ،
(مقیم حال مدینہ منورہ)

ہمارا روایتِ حفص کا امتحان بھی جناب قاری کریم بخش صاحب نے
لیا تھا۔ اس وقت بھی حضرت قاری صاحب تشریف فرما تھے۔ میرے پورے نمبر
آگے پڑتیل و حد میں اور اتنے ہی کتابوں میں۔ یہ سب حضرت قاری صاحب
کی محنت کا نتیجہ تھا۔ اس لیے کہ شاگرد کی امتیازی کامیابیاں اسٹاذ کی قابلیت کا منظر
ہوا کرتی ہیں۔

تقریباً دو ڈھائی سال کے عرصہ میں ، اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم اور
حضرت الاستاذ کی خاص توجہ سے قرآن مجید حفظ کر لیا اور پھر وہیں تجویذ و قرابت
روایتِ حفص کی کلاس میں داخل ہو گیا اور اتنا ہی عرصہ اس کی تکمیل پر لگا ،
گو میں اس وقت استاذ محترم مولانا سید قاری حسن شاہ صاحب بخاری مدظلہ العالی
کے درجہ میں تھا لیکن اس دوران میں بھی حضرت قاری صاحب میرا سپارہ باقاعدہ
سنتے رہے۔ اس پانچ سال کے طویل عرصہ میں مجھے حضرت قاری صاحب کا نہایت
ہی قرب حاصل رہا۔ اخبارات ، کتب عموماً مجھ ہی سے پڑھا کر سنتے اور خطوط بھی
مجھ ہی سے لکھواتے تھے۔ جب آپ کے اہل و عیال کوچہ کنڈیگران سے جیاموئے
اپنے نئے تعمیر کردہ مکان میں منتقل ہو گئے تو وہاں سے حضرت قاری صاحب کا کھانا
لانے کی خدمت بھی میرے ہی سپرد تھی۔ مجھے کل دو ہی چیزوں کا تو شوق تھا ،
ایک قرآن کریم پڑھنے کا اور دوسرا قاری صاحب کی خدمت کا۔ میں اسی کو سب
کچھ سمجھتا تھا۔ میرے اس زمانہ میں قاری صاحب پڑھانے کے بعد کافی تھکاوٹ

محسوس کرتے تھے۔ ہم دو چار طالب علم اپنا سبق و سیپارہ یاد کر کے قاری صاحب کو دبا کر تے تھے۔ کبھی وہ نہ ہوتے تو میں موجود رہتا تھا۔ ایک مرتبہ انہیں دباتے دباتے کافی رات گزر گئی۔ آپ سو گئے تھے، مجھے جانے کے لیے چونکہ آپ نے حکم نہ فرمایا تھا۔ اس لیے برابر دباتا رہا۔ اچانک آپ کی آنکھ کھلی تو ازراہ شفقت فرمایا:

”استغفر اللہ! ارے اللہ کے بندے اب تک دبا رہے ہو؟ کیا

وقت ہے؟“

میں نے عرض کیا:

”ڈیڑھ دو بجے کا وقت ہوگا“

فرمانے لگے:

”تم گئے کیوں نہیں۔ اگر میں سو جاؤں تو مجھے سوتا چھوڑ کر اسی

وقت چلے جایا کرو، جاؤ، جا کر آرام کرو، تمہیں اپنے آرام کا بھی

خیال نہیں“

میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ ہر طالب علم کو قاری صاحب کی ادنیٰ خدمت کر کے

انتہائی خوشی ہوتی تھی۔ جب آپ کسی کام کے کرنے کو حکم فرماتے تو آپ کے ہر

شاگرد کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ اللہ کرے مجھے یہ کام سونپ دیں۔ جسے حکم ملتا،

وہ بسر و چشم بجالاتا۔ شاید میرے احباب ان باتوں پر حیران ہوں۔ لیکن میں نے

مبالغہ سے بالکل کام نہیں لیا۔ اب اساتذہ کی خدمت کے جذبے کم ہو گئے ہیں۔

ان کا ادب و احترام نہیں رہا، استاد اور شاگرد کے مابین وہ علاقے ختم ہوتے

جا رہے ہیں جو پہلے ہوا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ انحضرت علی المرتضیٰ سے راضی ہوں

کیا ارشاد فرما گئے ہیں :-

” اَنَا عَبْدٌ مِّنْ عِلْمِنِي حَدٌّ فَا وَاحِدًا “

کہ جس سے میں نے ایک حرف بھی سیکھا میں اس کا غلام ہوں ۔
علماء نے لکھا ہے کہ :-

اپنے استاذ کی آواز سے اپنی آواز اونچا کرنا صریحاً ناشائستگی

ہے

مجھے یاد نہیں کہ کبھی حضرت قاری صاحب سے میں نے کھل کر اور بے باک ہو کر گفتگو کی ہو، ادب مانع رہتا، جو آپ نے پوچھا اس کا جواب دے دیا اور بس اور آپ کے تمام شاگردوں میں یہی بات پائی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک طالب علم نے بڑی بے باکی سے جواب دے دیا تو آپ ہنسنے لگے اور بعد میں بھی جب کبھی اس کی بات یاد آتی تو بے ساختہ ہنس پڑتے۔ قاری صاحب نے اس طالب علم سے پوچھا :-

” کیوں بھی سنتی یاد ہو گیا اے :- (بارعب آواز میں)

اس نے اسی لہجہ میں جواب دیا :-

” ہور ہونٹرا نہیں سی “

آج کل چونکہ نابینا حفاظ کی سرزنش مجلات میں ہدف تنقید بن رہی ہے

اس لیے دوست یہ خیال نہ کریں کہ قاری صاحب کی مار سے یہ طلبہ سہمے رہتے تھے

اور کھل کر بات نہیں کر سکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت نے اس تمام عرصہ

میں، مجھے مازا ہے نہ سزا دی ہے۔ میں عینی شاہد ہوں اور عینی شاہد کی شہادت

ہمیشہ معتبر تسلیم کی جاتی ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراض ہے کہ مجھ سے بہت کوتاہی
 ہوئی۔ قصور ہوئے۔ آپ کے ادب کا پورا لحاظ نہیں ہو سکا (اللہ معاف
 فرمائیں) لیکن قاری صاحب نے ہمیشہ پیار سے سمجھا دیا اور اصلاح کر دی۔ اگر
 کسی غلطی پر آپ ناراض ہو جاتے تو واقعہ یہ ہے کہ جسمانی سرزنش تو کجا، آپ کی
 چشم غضب ناک برداشت نہیں ہوتی تھی۔

ہم نے الفت کی نگاہیں دیکھیں
 جانیں کیا چشم غضب ناک کو ہم؟
 آپ کی شفقت عام تھی، آپ کے بھی شاگرد فرداً فرداً یہی سمجھتے تھے
 کہ حضرت کو جتنی مجھ سے محبت ہے اور دلوں سے نہیں۔ سب سے زیادہ محبت مجھ سے
 ہے۔ میں نے اپنی تمام عمر میں حضرت الاستاذ حافظ الحدیث والقرآن مولانا
 محمد عبداللہ صاحب درخواستی دامت برکاتہم اور حضرت قاری صاحب جیسا
 شفیق استاد کبھی نہیں دیکھا۔ کوئی شخص اپنے بیٹوں سے ایسی محبت و شفقت
 نہیں کر سکتا جتنی ان حضرات کو اپنے شاگردوں سے کرتے دیکھا ہے۔ حضرت
 قاری صاحب کے کسی شاگرد یا ملنے والے کو اگر کوئی تکلیف پہنچتی تو آپ
 فوراً غمگین ہو جاتے اور یوں محسوس ہوتا جیسے ان کی صلیبی اولاد کو پہنچی ہے،
 بقول امیر سے

خنجر چلے کسی پر تڑپتے ہیں ہم امیر
 سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

قاری صاحب کے مزاج میں ظرافت بھی پائی جاتی تھی۔ موقع و محل

کی مناسبت سے کبھی کبھی کوئی لطیفہ بھی سنا دیتے۔ ایک مرتبہ کسی نے یہ کہا کہ فلاں
حافظ صاحب کے شاگردان کی موجودگی میں شور مچاتے رہتے ہیں اور ان سے نہیں
ڈرتے۔ آپ نے فرمایا کہ :-

” ایک حافظ صاحب سے کسی نے یہی گلہ کیا تھا کہ بڑے آپ کے
سامنے شور کرتے رہتے ہیں اور آپ سے مطلقاً نہیں ڈرتے، تو انہوں
جو اب دیا کہ اگر یہ مجھ سے نہیں ڈرتے، تو میں کون سا ان سے ڈرتا ہوں؟
سب ہنس پڑے۔“

اسی طرح طخیوں (ہزارہ والوں) سے خوش طبعی فرماتے رہتے، کبھی حافظ
محمد امیر صاحب سے اور کبھی قاری عبدالحکیم سائیں سے، ہزارہ کی زبان بولتے، اور
فرماتے کہ :-

” یہ ہر لفظ پر پیش پڑھتے ہیں۔ صادق کو صادق اور اہل سخن کھتے
چھوڑیا امی وغیرہ۔“

حضرت قاری صاحب بڑے متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ انہوں نے اپنے
آپ کو کبھی بڑا بنانے کی سعی نہیں کی۔ ہمیشہ اپنے آپ کو چھوٹا سمجھتے تھے۔ دوسروں
کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ اپنے استاد حضرت قاری کریم بخش صاحب
کے سامنے بڑے مودب ہو کر بیٹھتے اور مودبانہ گفتگو کرتے۔ سہمے رہتے۔ زیادہ بات
چیت نہ کرتے۔ بلکہ جب اپنے کسی شاگرد استاد کے پاس جاتے تو ان کا پورا احترام
کرتے۔ میں نے دیکھا ہے کہ آپ اپنے شاگرد قاری محمد شریف صاحب کے کمر
میں بھی تشریف لے جاتے تو دو زانو ہو کر بیٹھ جاتے۔ یوں محسوس ہوتا جیسے

قاری محمد شریف صاحب اسٹاذ اور آپ ان کے شاگرد ہیں۔ حالانکہ معاملہ برعکس تھا۔ اور دوسری بات یہ کہ آپ مدرسہ کے بانی اور صدر مدرس بھی تھے۔ اس کے باوجود اتنی تواضع اور انکسار ہی آپ کے مزاج میں پائی جاتی تھی۔ یہ اللہ دالوں کی نشانی ہے سچ کہا کسی کئے دالے نے یہ

فرد تنہی است دلیل رسیدگان خدا

چوں سوار بنزل رسید پیادہ شور

قاری صاحب بہت عمدہ قرآن کریم پڑھتے تھے تلاوت میں مدد جزر کی سی کیفیت ہوتی۔ سننے والے یہی خیال کرتے کہ کوئی جوان قاری پڑھ رہا ہے۔ اس عمر میں، اور پھر آواز میں یہ بلندی اور کشش! ماشاء اللہ!

ع یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

جب آواز بلند کر کے پڑھتے تو سامعین جھومنے لگتے۔ عذاب کی آیتوں کی تلاوت کے دوران آپ پر رقت طاری ہو جاتی اور سماعت کے وقت بھی یہی حال ہوتا۔ رفیق محترم حافظ محمد صاحب راوی ہیں کہ ایک مرتبہ شبینہ میں قاری صاحب

میرا ۲۹ واں سپارہ سن رہے تھے جب میں نے یہ آیات پڑھیں:

وَ اٰمٰنٌ اَدَّتْ كِتٰبَهُ بِشِمَالِهٖ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْت

كِتٰبِيْهِ ۝ وَ لَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيْهِ ۝

تو قاری صاحب پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ غش کھا کر گر پڑے۔

آپ کو قرآن مجید پڑھانے کا بے پناہ شوق تھا۔ بڑی محنت سے پڑھاتے تھے

ان کی یہی خواہش ہوتی کہ میرے شاگرد بالکل میرے جیسے ہو جائیں۔ مشہور

ٹیسٹ کریکٹر شجاع صاحب کو آپ نے قرآن کریم پڑھایا اور مشق کرائی۔ آپ کے بالکل ابتدائی شاگردوں میں سے ہیں۔ شجاع صاحب نے ایک مجلس میں چند آیات تلاوت کیں۔ جناب الحاج محمد یوسف صاحب سیٹھی بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے، تڑپ اٹھے اور تجوید و قرأت کی طرف — مائل ہوئے۔ آج ان کی مالی اعانت سے اندرون و بیرون ملک ہزاروں کی تعداد میں تجوید و قرأت کے مدارس چل رہے ہیں۔ اللہ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے، مزید ہمت دے۔ آمین) اور حضرت قاری صاحب کے ایسے گروں ہوئے کہ ہر رمضان میں انہیں کراچی لے جاتے۔ وہاں ان کا پورا قرآن کریم تراویح میں سنتے اور دن کو قرآن کریم کے مدارس کا افتتاح آپ کے ہاتھوں کرواتے۔ کراچی کے اکثر قرآنی مدارس کا افتتاح آپ ہی کے ہاتھوں ہوا۔ سب قرآنی ادارے آپ کی بہترین یادگاریں ہیں۔

آپ کو تدریس کا اتنا شوق تھا کہ بیماری کے دوران بھی پڑھاتے رہے۔ جب ڈاکٹروں نے پڑھانے سے روک دیا تو فرمانے لگے: ”اللہ تعالیٰ ڈاکٹروں کو ہدایت بخشے، مجھے قرآن پڑھانے سے نہ روکیں۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا، میرا جی چاہتا ہے کہ آخری دم تک پڑھتا رہوں۔“

اور جب بیماری نے بالکل بے بس کر دیا اور پڑھانے سے معذور ہو گئے تو اللہ تعالیٰ سے یہ دعائیں مانگنے لگے:۔

اے اللہ! اب خود پڑھنے کی ہمت نہیں رہی، مجھے قرآن مجید

سننے سے محروم نہ کیجیو! میری آرزو یہی ہے کہ قرآن کریم سنتے سنتے

آپ سے آملوں۔“

اللہ نے آپ کی یہ دعا کیسی قبول فرمائی کہ قرآن کریم سنتے سنتے ہی اللہ سے جا ملے۔

فقاری صاحب بڑے مستقل مزاج تھے۔ کسی کام کے چل نکلنے کے لیے استقلال کی سخت ضرورت ہوتی ہے، آپ میں یہ صفت بدرجہ اتم موجود تھی۔ آپ نے اولاً مسجد چینیانوالی میں کام شروع کیا تو اس وقت آپ کے پاس صرف ایک طالب علم تھا۔ آپ نے طلبہ کی قلت اور کثرت کو ملحوظ خاطر نہ رکھتے ہوئے نہایت استقلال کے ساتھ پڑھانا شروع کر دیا اور برابر بیس سال تک وہاں پڑھاتے رہے۔ رفتہ رفتہ طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور سینکڑوں حفاظ و قسّار وہاں سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد مولانا داؤد غزنوی جو اس مدرسہ کے مہتمم تھے، سیاست میں آگئے اور ان کی توجہ مدرسہ سے ہٹ گئی۔ پھر ۱۲ اگست ۱۹۵۰ء میں مسجد نور موتی بازار میں مدرسہ تجوید القرآن کی بنیاد رکھی۔ رفیق مكرم حافظ محمد یوسف صاحب (جیاموسے والے) کی روایت کے مطابق اس وقت آپ کے پاس پڑھنے والوں کی تعداد ۳۰ تھی اور اتنے ہی روپے تھے۔ آپ نے لوگوں سے چندہ کی اپیل کی تو لوگوں نے کہا:

”بھلا یہ نابینا حافظ کیا مدرسہ چلائے گا؟“

ٹھیک ایک سال کے بعد مدرسہ کا نقشہ بنی اور تھا۔ چار سو پڑھنے والے اور چوب

پڑھانے والے تھے۔ مدرسہ کا چار ہزار روپیہ جمع تھا۔ پھر یہ جگہ بھی ناکافی ہو گئی اور ایک مستقل مدرسہ کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی۔ اسی دوران آپ نے مدرسہ کے انتظامی امور کو بہتر طور پر چلانے کے لیے "مجلس اشاعت القرآن" قائم کی اور مدرسہ کا انتظام اس کے سپرد کر دیا۔ جناب محمد یوسف صاحب سیٹھی کے بڑے بھائی جناب محمد عبداللہ سیٹھی تھے۔ آپ نے ۱۹۵۳ء میں ساڑھے چودہ ہزار میں مدرسہ کے لیے ایک قطعہ زمین خریدا اور مدرسہ کی دو منزلہ عمارت کے علاوہ، ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد بھی تعمیر کروائی۔ فرمایا کرتے تھے:

"میں نے محض رضائے الہی کے لیے یہ مدرسہ قائم ہوا ہے۔ اس کی ترقی کے لیے محنت کی ہے اور اللہ تعالیٰ سے نہایت نضرع کے ساتھ دعائیں مانگی ہیں۔ اللہ میری اس قرآنی خدمت کو قبول فرمائے اور قائم و دائم رکھے۔"

آپ کی محنت و استقلال ہی کا نتیجہ تھا کہ مدرسہ میں ۱۲۲ اسٹاڈنٹس رہتے تھے اور طلبہ کی تعداد ۶۵۰ تھی۔

مجلس ابنائے قدیم

اس سے پہلے انجمن اشاعت القرآن کا ذکر ہو چکا ہے، کہ آپ نے یہ انجمن قائم کی، اسے رجسٹرڈ کروایا اور مدرسہ کو شخصی ملکیت نہیں بنایا بلکہ اس کا انتظام اس انجمن کے سپرد کر دیا۔ اب بھی ماشار اللہ مدرسہ اس انجمن کی سرپرستی میں بڑھا کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے اپنے فارغ ہونے والے طلبہ کی ایک جماعت بنائی، اس کا نام مجلس ابنائے قدیم رکھا جس طرح

دوسرے اداروں کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشنز ہوتی ہیں۔ اسی طرح کی ایک یہ بھی ہے۔ مدرسہ کی ہنگامی ضروریات کے موقع پر جوان حفاظ و قرار کی یہ مجلس پورے جوش و خروش سے سامنے آجاتی ہے اور داء، ورمے، سخیے ہر قسم کا تعاون پیش کر دیتی ہے۔ حافظ محمد حفیظ صاحب (حافظ جی لوہے داسے بیڈن روڈ لاہور) اس کے صدر اور جناب حافظ قاری محمد مشتاق صاحب اعظم کلا تھمارکیٹ اس کے جنرل سیکرٹری ہیں۔ حضرت قاری صاحب کی سوانح کو منتظر عام پر لانے کا سہرا بھی انہی کے سر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مجلس کی مساعی کو اپنے دربار میں قبول فرمائے اور اس کے تمام ممبران کو قرآن کریم کی خدمت کرنے کی اور اس کے پیام کی روشنی میں چلنے کی توفیق بختے۔ آمین۔ مصر کے قومی شاعر احمد شوقی نے کیا خوب کہا ہے :-

الصَّالِحُونَ يَبْنُونَ أَنْفُسَهُمْ

وَالْمُصْلِحُونَ يَبْنُونَ الْجَمَاعَاتِ

قاری صاحب اگرچہ نابینا تھے لیکن بہترین منتظم تھے۔ مدرسہ تجوید القرآن کے بانی اور صدر مدرس تھے۔ پورے مدرسہ کا انتظام نہایت خوش اسلوبی سے چلاتے، مدرسہ کے علاوہ رمضان کے آخری عشرہ میں لاہور کی مختلف مساجد میں شبینے ہوتے اور آپ اس نظم و ضبط کے ساتھ اپنے شاگردوں میں سیپارے تقسیم کر دیتے کہ بیک وقت چوبیس چوبیس مساجد میں شبینے ہو رہے ہوتے تھے لیکن کہیں کوئی بد نظمی نہ ہوتی کہ کسی کو اعتراض کا موقع ملتا۔ آپ خود بھی شبینوں میں پڑھتے اور کبھی کبھی چار چار سیپارے پڑھ جاتے۔ ان سے

شعبینوں کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ فن تجوید معروف ہو گیا اور مختلف عمر کے طلبہ کے پڑھنے سے سامعین میں شوق پیدا ہوا اور انہوں نے بھی اپنے بچوں کو سکول سے اٹھا کر مدرسہ میں داخل کر دیا۔ حفظ کے بعد دو چار سالوں میں سکول کی تعلیم بھی پوری کر دی۔ اس طرح طلبہ قرآن کے حافظ بھی بن گئے اور ساتھ ہی سکول کی تعلیم سے بھی محروم نہ رہے اور وقت بھی زیادہ صرف نہ ہوا۔

جلسہ تقسیم اسناد

قاری صاحب سالانہ جلسوں کا اہتمام بھی فرماتے تھے اور بڑے بڑے علمائے کرام کو دعوت دیتے اور وہ جلسوں سے خطاب فرماتے اور فارغین کو اسناد تقسیم کی جاتیں۔ میرے تعلیمی دور ہی میں آپ نے ایک جلسہ منعقد کروایا۔ اس پر حضرت الاستاذ مولانا احمد علی صاحب امیر اسٹجین خدام الدین اور حضرت الاستاذ مولانا محمد عبداللہ صاحب درخواستی دامت برکاتہم کو خاص طور پر دعوت دی۔ یہ دونوں بزرگ تشریف لے آئے۔ ان بزرگوں کی تشریف آوری سے آپ نے حدنوش ہوئے۔ مجھے ٹھیک یاد ہے کہ جب حضرت درخواستی مدرسہ کے شرقی گیٹ پر پہنچے تو اس وقت حضرت مولانا احمد علی صاحب تقریر فرما رہے تھے۔ جونہی حضرت درخواستی پر نظر پڑی، تقریر وہیں چھوڑ دی بہایت تیزی سے گیٹ پر پہنچ گئے۔ حضرت درخواستی سے معاف کیا، ساتھ لائے، بٹھایا اور جہاں تقریر چھوڑی تھی وہیں سے شروع کر دی۔ ان کے بعد حضرت درخواستی نے خطاب فرمایا۔ لوگ دور رہے تھے۔ حضرت نے فرمایا:-

”دیکھو! اللہ نے اس نابینا حافظ سے وہ کام لیا ہے جو بڑی

بڑی آنکھوں والے نہیں کر سکے۔

اور قاری صاحب کو دعائیں دیں۔ اسناد کی تقسیم کبھی حضرت مولانا قاری عبدالملک صاحب کے ہاتھوں ہوتی اور کبھی قاری کریم بخش صاحب ہاتھوں۔

قاری صاحب اور ان کے معاصرین

قاری صاحب کے معاصرین میں سے سب سے بڑے بزرگ اور امام فن

استاذ الا سائذہ حضرت مولانا قاری عبدالملک صاحب ہوئے ہیں۔ میں نے دیکھا

ہے کہ اگر حضرت قاری عبدالملک صاحب مدرسہ تشریف لائے تو ہمارے

قاری صاحب بے حد خوش ہوتے، ان کی بے حد تحکیم کرتے۔ اور اگر انہیں

وہاں جانا ہوتا تو حضرت قاری عبدالملک صاحب ان کا بہت خیال رکھتے اور

اکرام کرتے۔ ایک مرتبہ قاری صاحب ————— حضرت قاری عبدالملک

صاحب کے ہاں دارالعلوم الاسلامیہ، پرانی انارکلی تشریف لے گئے۔ قاری

صاحب بڑے تپاک سے ملے، اپنے پاس بٹھایا، عرب کی کبھوریں دیں اور آپ

زم زم عطا کیا اور قاری صاحب کی معیت کی وجہ سے مجھے بھی اپنے دست اقدس

سے انہی تبرکات سے نوازا۔ آتے وقت دروازے تک الوداع کہنے کے لیے

سائند تشریف لائے۔

استاذی المکرم جناب قاری عبدالوہاب صاحب کی بھی آپ کی بہت

قدر کرتے تھے۔ بارہا ہمارے سامنے قاری صاحب کے فضائل بیان کیے۔

جناب قاری محمد اسماعیل صاحب آپ کے استاذ بھائی بھی تھے۔ لیکن آپ

نے ان کا ہر موقع پر احترام ملحوظ رکھا اور ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔

قاری صاحب اور فن خطابت

حضرت قاری صاحب نے اونچی مسجد کناری بازار میں سالہا سال تک خطابت کے فرائض انجام دیے۔ تقریریں آپ سب سے پہلے اللہ کی حمد بیان کرتے، اس کے بعد ورود شریف اور پھر پورے جوش و خروش کے ساتھ موقع محل کی مناسبت سے تقریر فرماتے۔ تقریر کرتے ہوئے آپ کا رنگ سرخ ہو جاتا تھا۔ آنکھوں میں "سرور عشق" اور چہرے پہ "نور یقین" ہوتا۔ جگر مراد آبادی مرحوم اگر حضرت کی تقریر سن لیتے تو شاید پھر انہیں واعظ سے یہ گلہ نہ رہتا۔

واعظ کا ہر ارشاد بجا، تقریر بہت دل چسپ مگر
آنکھوں میں سرور عشق، چہرے پہ یقین کا نور نہیں

آخری تقریر

۱۷ فروری ۱۹۶۷ء کو جمعہ کی آخری تقریر فرمائی اور آپ حضرت مولانا سید اسماعیل شہیدؒ کا خطبہ پڑھا کرتے تھے۔ سن کر سرور آجاتا تھا۔ پھر اس کے بعد اس مسجد میں قاری صاحب ایسا مقرر آیا نہ خطیب! ۱۸ فروری کو بیمار ہو گئے۔

قاری صاحب کا سیاسی رجحان

قاری صاحب دلیسے تو کبھی مکاتب فکر کے علماء کی عزت کرتے تھے اور اپنے شاگردوں کو بھی سیاست میں نہیں الجھاتے تھے لیکن وہ دل و جان سے جمعیت علماء اسلام کو چاہتے تھے اور انہی بزرگوں کو اپنی سیاسی مقتدی و پیشوا سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے پاس یہ رسائل "خدا م الدین"، "پیام اسلام" اور "رجحان اسلام" باقاعدگی کے ساتھ آتے تھے۔ اس کے علاوہ کبھی کوئی دوسرا رسالہ میرے

نے نہیں دیکھا نیز قاری صاحب انہی رسائل کے پڑھنے کی اپنے گھر والوں اور دیگر
ملنے والوں کو تاکید فرماتے تھے اور ان کے وصال کے بعد بھی اول الذکر اور
مؤخر الذکر ہر دور سارے اسی طرح آتے ہیں جس طرح آپ کی زندگی میں آتے تھے
بڑے قاری صاحبؒ

آپ مدرسہ اور بیرون مدرسہ بڑے قاری صاحبؒ کے نام سے مشہور تھے
میں نے کئی بار حضرت قاری کریم بخش صاحب کو یہ فرماتے سنا۔
"کیوں جی بڑے قاری صاحبؒ! یہ مسئلہ اسی طرح ہے"
توضیح کرتے کہ :-

"حضرت! مجھے کچھ اسی طرح یاد پڑتا ہے"

احترام استاذ کا بے حد پاس کرتے اور ان کے بڑا کئے سے آپ خفت محسوس
کرتے۔ قاری صاحب بڑے کیوں ہوئے۔ انہیں اس لقب سے کیوں یاد کیا جانا
تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انہوں نے عمر بھر اپنے آپ کو چھوٹا بنائے رکھا۔ اللہ
پاک نے انہیں اٹھایا اور بڑا بنا دیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ نے
اپنی تمام خداداد صلاحیتیں قرآن کریم کی خدمت میں لگا دی تھیں۔ اللہ کی اس عزت
والی کتاب کے ساتھ جو لگ جاتا ہے وہ چھوٹا نہیں رہتا۔ اللہ اسے بلند کر دیتے ہیں
حدیث پاک میں ہے :-

عن عمر بن الخطاب قال قال رسول الله صلى الله
عليه وسلم ان الله يرفع بهذا الكتاب اقواما
يضع به اخين (مسلم)

”حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب پاک — قرآن مجید کی وجہ سے بہت سوں کو اونچا کرتا ہے اور بہت سوں کو نیچا کرتا ہے اور کرے گا“

”اللہ پاک کا فیصلہ ہے کہ جو قوم اور امت اس کے ساتھ وہ تعلق رکھے گی جو کلام اللہ ہونے کی حیثیت سے اس کا حق ہے، اللہ تعالیٰ اس کو دنیا و آخرت میں سر بلند کرے گا اور اس کے برعکس جو قوم اور امت اس سے انحراف اور سرکشی کرے گی وہ اگر بلندیوں کے آسمان پر بھی ہوگی تو نیچے کر دی جائے گی“

”قاری صاحب سے آخری ملاقات

قاری صاحب کی علالت کے دوران دو تین مرتبہ حاضر فی کا موقع ملا، بڑی شفقت فرمائی۔ گھریلو حالات اور تعلیمی کوائف پوچھے۔ خوشی کا اظہار فرمایا، اور دعائیں دیں۔ میں نے عرض کیا کہ:

”حضرت ایہ سب کچھ آپ کی جوتیوں کا صدقہ ہے“

فرمانے لگے:

”نہیں بلکہ قرآن کریم کا صدقہ ہے“

دوسری ملاقات پر میں نے گھر کی نبی ہونی مٹھوڑی سی مسٹھانی ہدیہ پیش کی

فرمانے لگے:

”آپ نے کیوں تکلیف کی، میں تو کھا نہیں سکتا“

میں نے عرض کیا :-

”گھر کی بنی ہوئی ہے۔ آپ کے لیے لایا ہوں۔“

میری خاطر تھوڑی سی اٹھا کر چکھ لی۔

۱۵/۵/۲۰ سے ۲۰/۵/۲۰ تک تو آپ کے پاس رہا۔ پھر گا ہے گا ہے ملاقات ہوتی رہی۔ ایک آدھ مرتبہ حضرت میرے قیام حویلیاں کے دوران تشریف بھی لائے۔ پھر لاہور میں کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی۔ ان مصروفیات کو کیا کہا جائے کہ انہوں نے حضرت الاستاذ سے بھی دور، دور رکھا۔ یہ چودہ پندرہ سال کا عرصہ ایسے گزر گیا کہ پتہ بھی نہیں چلا۔ شاعر نے سچ کہا ہے :-

ثَمُونٌ وَيَنْقُضِينَ وَ مَا شَعْرًا

بِأَنْصَابٍ ثَمُونٌ وَ لَا سِدَانُ

”کہ مینے ایسے گزرتے گئے کہ ان کے اول و آخر کا ہمیں پتہ نہ چل سکا۔“

آخری ملاقاتوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اب ان سے فائدہ حاصل کرنے کا موقع ہے، فائدہ اٹھا لو، دعائیں لے لو، پھر کل کی خبر نہیں۔ ۱۶ اپریل ۱۹۶۰ء سے گورنمنٹ ڈگری کالج شیخوپورہ میں میری تقرری ہو گئی۔ میں ہر روز جیاموسی آپ کے مکان کے قریب سے بس پر گزر جاتا۔ آپ کے گھر کی ہواؤں اور نضار سے مخطوط ہوتا اور کہتا :-

تَمَتُّعٌ مِنْ شَمِيمٍ عَدَا مِنْ نَجْدِ

فَمَا بَعْدَ الْعَشِيَّةِ مِنْ عَدَا

قاری صاحب کا وصال

اِرِيْدُ وَاَسْأَلُهُ وَاِيْرِيْدُ هَجْرِي

فَاتْرُكْ مَا اُرِيْدُ لِمَا يُرِيْدُ

ایک روز شیخ پورہ سے واپسی پر، جیاموسے سے قاری صاحب کے داماد قاری حافظ نویر احمد صاحب اسی بس میں سوار ہوئے، میں نے قاری صاحب کے خیریت پوچھی۔ انہوں نے بتایا۔ الحمد للہ ٹھیک ہیں۔ غالباً دوسرے ہی روز کسی ضروری کام سے مجھے پشاور جانا پڑ گیا۔ دو چار دن لگ گئے۔ واپس آیا تو جامع سنت گھرہ انارکلی میں نماز ادا کرنے کے لیے پہنچا، وہاں محترم المقام حضرت الامام قاری بشارت علی صاحب سے ملاقات ہوئی، فرمانے لگے: "آپ کو معلوم ہے کہ قاری فضل کریم کا وصال ہو گیا۔ سنتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور زبان پر وہ آیت آئی جو ایسے موقعوں پر آیا کرتی ہے۔ انا لله وانا اليه راجعون"

وہ بھی بچھڑ گئے کہ مجھے جن پہ ناز تھا

نوحہ یہ زندگی کا سناؤں کہاں کہاں

مسکینی کی حالت میں موت

آپ زندگی میں اکثر مسکینی کی موت والی دعا پڑھا کرتے تھے۔ وہ قبول ہو گئی، آپ کو گھر سے میٹرو ہسپتال منتقل کیا گیا۔ وہاں آپ کے شاگرد اور دیگر اعزہ آجاتے۔ ۲۳ جون بروز منگل صبح ۱۱ بجکر ۵۵ منٹ پر آپ کا انتقال ہوا۔ اس وقت عزیز محترم حافظ قاری شجاع الدین ہزاروی آپ کے پاس

سورہ یسین پڑھ رہے تھے۔ اس طرح آپ کی ایک چھوڑ، دو دعائیں قبول ہو گئیں :-

۱۔ ایک مسکینہ کی حالت میں موت

۲۔ دوسرا قرآن سنتے سنتے آپ سے آملوں۔

۳۔ ہے رشک ایک خلق کو جو ہر کی موت پر

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

غسل کے بعد شجاع الدین صاحب کی روایت کے مطابق چہرہ بہت نکرا
واٹھا۔ نور ٹپک رہا تھا۔ لبوں پر مسکراہٹیں کھیل رہی تھیں۔

۴۔ نشان مرد مومن با تو گویم

چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

پ کے انتقال کی خبر آنا نا نا لاہور بلکہ پورے ملک میں پھیل گئی۔ ریڈیو سے

علان ہوا۔ تجوید و قراءت کے مدارس کے طلبہ، اساتذہ اور دیگر علمائے کرام

اور متعلقین جو حق در جو حق "جیاموسے" پہنچنے شروع ہو گئے۔ رات کے پرسکون

ماحول میں وصیت کے مطابق جناب حافظ قاری محمد رفیع صاحب مہتمم مدرسہ

تجوید القرآن نے نماز جنازہ پڑھائی اور آپ کے سینکڑوں شاگردوں کے

موجودگی میں آپ کی تدفین ہوئی۔

تعزیتی قرار داریں

یوں تو آپ کے انتقال کے بعد بہت سی مساجد و مدارس میں تعزیتی

قرار داریں پاس ہوئیں اور ایصالِ ثواب کیا گیا لیکن سب سے بڑی تعزیتی

قرار دادیں جمعیتہ علمائے اسلام کی سہ روزہ آئین شریعت کانفرنس ۱۹۶۰ء لاہور میں برابر تین روز تک پاس ہوتی رہیں اور ایصالِ ثواب کیا جاتا رہا۔ آخری روز کی قرار داد حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی مدظلہ العالی نے پیش کی قاری صاحب کی موت کو ناقابلِ تلافی نقصان بتایا۔ قاری صاحب کی بلندی درجات کی وعائتگی اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی۔ میں خود اس وقت موجود تھا۔ ہر طرف سر ہی دکھائی دیتے تھے۔ لوگوں کا ایک سمندر تھا جو ملک کے اطراف و جوانب سے اکٹرا رہا تھا۔ حضرت الاستاذ مولانا درخواستی صاحب نے فرمایا تھا۔

”ایسی کانفرنس پہلے ہوئی نہ اب ہوگی۔“

اخبارات نے اس کانفرنس میں شرکاء کی تعداد ڈیڑھ لاکھ لکھی تھی۔ تو گویا حضرت قاری صاحب کے لیے ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں نے مغفرت کی دعا کی، جن میں بڑے بڑے علماء کرام بھی تشریف رکھتے تھے۔ اتنے بزرگوں کی دعائیں ان شمار اللہ رائیگاں نہیں جائیں گی۔ جب تک قاری صاحب کے شاگرد و قرآن مجید پڑھتے رہیں گے اس وقت تک انہیں ثواب پہنچتا رہے گا اور نہ یہ ختم ہوں اور نہ وہ (ثواب) قاری صاحب کا ایک ایک شاگرد و شاہد اللہ ایک ایک ادارہ ہے۔ جب تک قاری صاحب کا یہ فن زندہ رہے گا قاری صاحب زندہ رہیں گے اور یہ کلام اللہ کی صفت ہے اسے زوال نہیں اور تجوید و قرأت اس کے اصول و ضوابط ہیں انہیں فنا نہیں۔

اللهم اغفر له، اللهم نور قلبه، اللهم اجعل قلبه
روضۃ من ریاض الجنة امین یا الہ العالمین

آہ! قاری فضل کریم صاحب

حضرت مولانا قاری اطہار احمد صاحب تقاضی مدظلہ العالی

صدر شعبہ تجوید و قرأت مدرسہ تجوید القرآن موتی بازار لاہور

دنیا میں انسانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے اور تاقیامت جاری رہے گا۔ کسی کسی قیمتی شخصیتیں کارگاہِ دہر میں اپنی گہری روشیں بنا کر جا چکی ہیں، آنے والے دیکھیں، روئیں، اپنی بے عمل زندگی پر شرمسار ہوں، مرنے والوں سے زیادہ خود اپنے اوپر قائم کرنے کو جی چاہے۔

ایسی ہی منفرد اوصاف کی شخصیت قاری فضل کریم صاحب، وہ قرآن کے خادم تھے۔ قوم کے بچوں کو حافظ قاری بنانے کے لیے دل میں بے انتہا تڑپ رکھتے تھے۔ حفظ قرآن کی دولت سے انہوں نے سینکڑوں بچوں کے سینوں کو منور کر دیا۔ طالب علم کی نفسیات سے وہ ایک باہر امراض طبیب کی طرح خوب واقف تھے، کسی سے نرمی اور کسی سے گرمی، کسی پر پیار اور کسی پر عتاب، مگر مقصد تمام پہلوؤں کا واحد کہ اس کی چھاتی قرآن کا خزانہ بن جائے کسی کی منزل رات کو سننے کا وقت مقرر ہو چکا ہے تو کسی کو صبح ٹھیک وقت پر پہنچنے کا حکم ہوتا ہے۔ یہ فلاں فلاں لڑکے اخیر جمعہ شب میں اذان فجر سے پہلے اپنی منزل و سبق سنائیں گے۔ پھر یہ معمول ہفتوں یا مہینوں

نہیں بلکہ سالہا سال چلیں گے، ذرا قریب سے قاری صاحب کے شاگردوں کا قرآن تو سنیے۔ سبحان اللہ! بچوں کی خوبصورت ادا، عمدہ تلفظ اور سرسری آواز ہے، جی چاہتا ہے کہ بس بیٹھے ہوئے سنتے ہی رہیں۔

استاد طلبہ سحر خیز ہیں۔ آدھی رات سے ہی اٹھ بیٹھتے ہیں، تہجد گزاری ہو رہی ہے۔ نوافل کی ادائیگی سے فراغت کے بعد منزل و سبق کا کام شروع ہے، اللہ اللہ، نور برس رہا ہے۔

تعلیم کے یہ معمولات ہوں، لوگوں کی داد و ستائش سے بے نیاز اور قطعاً بے پروا ہو کر خلوص کے جذبے سے خدمت قرآن ہو۔ تو برکات و رحمتوں کا نزول کیوں نہ ہو؟

اب تعلیمی معیار کی سر بلندی کے بڑے بڑے اصول وضع کیے جا رہے ہیں۔ حاضر یوں کے رجسٹر جدا ہیں۔ داخلہ کے سنا دار ریکارڈ علیحدہ مرتب ہو رہے ہیں، حاضر یوں اور غیر حاضر یوں کا شمار ہو رہا ہے۔ طلبہ اور اساتذہ کی حاضر یوں ہی کو سب سے بڑی تعلیمی کارکردگی کا راہنما اصول مقرر کیا گیا ہے۔

مگر اس تمام دماغی قابلیت اور ذہنی تنظیم کا نتیجہ پست ہے۔ استاد اور شاگرد کی دیوانگی کہاں سے آئے۔ دنیا میں حفظ قرآن کے کرانے والے ہر دور میں وہی اساتذہ کامیاب رہے جن کو اپنی عزیز عمریں اشاعت قرآن کے لیے فنا کر ڈالنے کا جذبہ نصیب ہوا۔

مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ، حدیث شریف میں معاشرہ کا

سب سے بہترین آدمی ہونے کا سرٹیفکیٹ قرآن شریف پڑھنے پڑھانے

والوں ہی کو تو دیا جا رہا ہے۔ ہمت سردانہ چاہیے آگے بڑھے اور اس نفع کو حاصل کرنے کے لیے جان کی بازی لگا دے۔

قرآن کی تعلیم کا کام سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ خلفاء راشدین کے علاوہ حضرت عبد اللہ بن مسعود، ابی بن کعب، زید بن ثابت اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم نے بڑا نام پیدا کیا۔ ان بزرگوں نے یہ کام جاری رکھا۔ قراءتوں کی تمام سندیں ان حضرات تک پہنچتی ہیں۔ تابعین اور تبع تابعین میں حضرات قراء عشرہ نے بڑا نام حاصل کیا۔

خدا م قرآن میں حضرت میاں جی نور محمد صاحب قدس سرہ کو پڑھے لکھے لوگ جانتے ہیں۔ ایک طرف ولی اللہی کا یہ مقام کہ جنید و بایزید بسطامی وقت تھے، چنانچہ رئیس قافلہ بزرگاں حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ نے حضرت میاں جی رحمۃ اللہ علیہ ہی سے بیعت حاصل کی اور خلانت حاصل کی۔ مگر اس ولی و شیخ ولایت کا دوسرا سادہ سا پہلو یہ تھا کہ ایک چھوٹے سے قصبہ لوہاری ضلع منظر نگر (یوپی) میں بچوں کو کتاب اللہ پڑھانے میں وقت گزارتے، اہل قصبہ میاں جی کہتے تھے۔ اندر سے جذبہ خیر کسب ہونے ہی کا تھا۔

حضرت قاری فتح محمد صاحب پانی پتی مدظلہ قاری رحیم بخش صاحب کی بیعت میں حضرت قاری فضل کریم سے ملاقات کے لیے اس وقت تشریف لائے جب قاری صاحب مرحوم سخت علیل تھے۔ قاری صاحب مرحوم نے درخواست کی کہ حضرت میرے لیے حسن خاتمہ کی دعا فرمائیں اور باصرار دعا کی درخواست کی، قاری فتح محمد صاحب نے بڑا پیارا، بھولا اور سادہ مگر مخلصانہ جواب فرمایا:

” اچھا قاری صاحب! جو حکم ہو، تابعدار ہیں۔ آپ قرآن کے

خادم ہیں اور ہم آپ کے خادم ہیں۔“

حضرت قاری صاحب مرحوم کو قرآن سے عشق تھا، خود عمدہ پڑھتے اور ہر اچھا پڑھنے والے کو داد و تحسین سے نوازتے، جس زمانہ میں راقم الحروف نے جامع مسجد چینیانوالی میں سترہمے میں پہلی مرتبہ جلسہ تقسیم اسناد منعقد کیا تو قاری صاحب نے بڑی خوشی اور بزرگانہ شفقت کے ساتھ شرکت فرمائی۔ مولانا داؤد غزنوی مرحوم صدر جلسہ تھے۔ طلبہ کی تلاوتیں ہو رہی تھیں، مولانا داؤد غزنوی تلاوت آیات پر زار زار رو رہے تھے، آنکھیں روتے روتے سرخ ہو چکی تھیں کہ میں نے حضرت قاری صاحب سے تلاوت کی درخواست کی، قاری صاحب نے بڑی بلند آواز میں تلاوت فرمائی ایسی تلاوت و وارفتگی کہ حاضرین اور صدر صاحب تڑپ اٹھے، سیرا حال تھا کہ

ٹیک نہ کر میری خشک آنکھوں پر

یوں بھی آنسو بہائے جاتے ہیں!

قرآن سننے کا آنا عمدہ ذوق نصیب ہوا تھا کہ پڑھنے والوں کی نہایت عمیق

خوبیاں بیان کرتے

اے شبِ تارِ زندگی کون تھی وہ کہانیاں

بھول کے بھی جو رہ گئیں یاد بھی آکے رہ گئیں

ریڈیو پر مصری قرار کی تلاوت اہتمام سے سنتے، قاری عبدالباسط کو خوب

داد دیتے، قاری صدیق نشاوی مرحوم کے عمدہ اوقات اور ان کے تنوع کی

تعریف ہوتی، مصطفیٰ اسماعیل کی پُرورد آواز پر جھومتے اور قاری زفعت مرحوم کے تو عاشق تھے ایک ایک آیت پر جھومتے اور سننے والوں کو تلاوت کی خوبیوں پر متوجہ فرماتے رہتے۔

مرحوم وقت کے بڑے قدر دان تھے۔ اپنے مشاغل سے جب بھی وقت فرصت ملا مصنفین کی نہایت معیاری اور نظر پاتی قسم کی تصانیف پڑھا کر سنتے تمام متداول مسائل پر مٹھوس رائے رکھتے تھے، سلف خصوصاً بزرگان دیوبند سے شفقت تھا۔ ان کی اکثر تصانیف پر وسیع نظر تھی چنانچہ ترکہ میں بڑی قیمتی اور عالیشان کتابیں چھوڑیں جو مرحوم اکثر بڑی سعی سے دور دراز مقامات سے منگواتے تھے۔ علمی ذوق کو سیراب کرتے رہنا، وقت کی قدر و قیمت کو بڑھانا ہے۔ ورنہ ہم ہیں آنکھوں والے بہت سے ایسے ہیں کہ عمر کو سطحی اور بیکار مشاغل پر شار کر ڈالتے ہیں۔

فرصتِ کار فقط چار گھڑی ہے یارو

یہ نہ سوچو کہ ابھی عمر بڑھی ہے یارو

حضرت قاری صاحب مرحوم اپنے اصولوں پر سختی سے کار بند رہتے۔ اپنے پختہ عقائد سے کسی حالت میں روگردانی نہ فرماتے، قاری صاحب بصارت سے محروم تھے مگر بصیرت کا حصہ وافر ملا تھا۔ عملی آدمی تھے۔ یہ ان کے عزمِ صمیم ہی کی برکت تھی کہ لاہور میں قرآن پاک کی سب سے بڑی درس گاہ چالو کر گئے۔ ایسی عظیم درس گاہ، جس سے سینکڑوں فاضلین حفظ و تجوید و قرأت نکلے اور کلام الہی کے اساتذہ بن کر ستاروں کی طرح ملک کے ہر حصہ میں تابندہ و فروزاں

میں اصل میں جن نفوس قدسینہ سے اللہ تعالیٰ کام لیتے ہیں ان کو "گزرنے" کا عزم و ولولہ بھی بخش دیتے ہیں۔ حالات و حوادث کی رکاوٹیں ان کے لیے سدّ راہ نہیں بنتیں۔ قاری صاحب مرحوم بڑے باہمت اور صاحب عزم انسان تھے، ان کا مذاق بڑا پاک اور سہرا تھا۔ مدرسہ کی تعمیر و ترقی میں انہوں نے کبھی تعلق یا سیادت فی کار راستہ اختیار نہیں کیا۔ باوقار زندگی اپنائی، توکل اور اعتماد علی اللہ کو ہی اپنا سب سے بڑا سرمایہ سمجھا۔ کام میں بڑی برکت و رونق ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کو یوں ہی منظور تھا کہ جو کام آنکھوں والے نہ کر سکیں ایک نابینا سے لے لیا جائے۔ قابل رشک ہے وہ نابینائی کہ عجب میں ایک عزم محکم کے ساتھ راہِ ہر و کلام اللہ کی نشرو اشاعت کا راستہ بنا پھلا جائے اور سینکڑوں آنکھوں والوں کو کلام اللہ کی جبلتیں تمہیں تمہا کر جنت کی راہ مستقیم دکھائے۔ حضرت قاری صاحب مرحوم کی مجموعی زندگی اس شعر کی تصویر تھی۔

یا کچھ نہ دکھائی دے یا عاف نظر آئے

جو سمیع ملی دھنلی وہ میں نے بچا دی ہے

مرحوم کے بلند اخلاق کا ایک نہایت بلند اصول یہ تھا کہ وہ سب کی عزت کرتے تھے خصوصاً اپنے اساتذہ اور بزرگوں کے سامنے انتہائی متواضع اور منکسر المزاج ہوتے۔ ایک معمولی مسکین طالب علم کی طرح بولتے بیٹھتے اور حاضری دینے ان کی موجودگی میں قالین اور فرش و میچہ پر ہرگز نہ بیٹھتے بلکہ معمولی جگہ پر دوڑانو بیٹھ جاتے۔

وہ اپنے ہم عمروں اور چھوٹوں سے بھی ادب و تواضع اور بھرپور کریمانہ

اخلاق سے پیش آتے۔ مدرسہ میں پڑھانے والے تمام اساتذہ کا احترام کرتے، اور چھوٹوں پر بڑی شفقت فرماتے۔ سب کی راحت کا خیال فرماتے۔ یہ اخلاق کا ایک مطلوب پہلو تو تھا ہی، مدرسہ کی تعلیمی ترقی و استحکام کا بھی ضامن تھا۔ مدرسہ کی فضا ایک سدا بہار گلزار تھی۔ جہاں نر مدرسین میں باہمی رقابت و چٹھک، نہ نظلمین و صدر مدرس سے کوئی گلہ و شکوہ۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک تعلیم گاہ کے لیے یہ حکمت عملی انتہائی ضروری ہے۔

ایک زاہد و عابد، ایک استاذ الاساتذہ، ایک سید الحفاظ و القراء، تعلیمات قراءت و حفظ کا ایک عظیم راہنما، سینکڑوں جید حفاظ و قراء کا مربی قریب تین سال شدید بیماری میں بھی پیکر صبر و رضا بنے رہنے کے بعد بالآخر واصل بحق ہوا۔ فراق کا یہ ناگزیر وقت سب کو پیش آنا ہے، لیکن پھر بھی اس فراق پر آنکھیں اشک بار ہوتی ہیں۔ احساسات المناک کرب سے دوچار ہوتے ہیں، مگر ساتھ ہی ایک بات تو ہم کہنی بھول ہی گئے کہ یہ درد و فراق اس وقت ایک المناک داستان بنتا ہے جب جانے والا جاتا ہے مگر اس کی تاریخ، اس کا عہد، اس کی مسلسل ساعی یادوں کے لیے ایک ٹیس بن جاتی ہے۔

وفات کے بعد مرحوم کا چہرہ پر کیسی شگفتگی تھی، تبسم کی دل آویز تصویر بنے ہوئے تھے۔ یہ شگفتگی میں نے اپنی عمر میں دو بزرگوں کے چہروں پر دیکھی ایک حکیم الامت حضرت تھانویؒ (جو حضرت قاری صاحبؒ کے بھی پیر تھے) کے چہرے پر اور ایک حضرت قاری صاحبؒ پر۔

بقول ابوال...

نشانِ مردِ مومن یا تو گویم
 چو مرگ آید بسمِ بر لبِ اوست

مَرِّبِ اغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَتَقَبَّلْ خَيْرَ مَسَارِعِنَا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُكَ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِیْ الْكَرِیْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یادِ اکابر

حضرت مولانا قاری محمد بشیر شریف صاحب

مہتمم، بانی و شیخ التجوید و القراءت دار القراء ماڈل ٹاؤن لاہور

استاذ محترم حضرت قاری فضل کریم صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا اہم گرامی
تر شاید پہلے ہی سن رکھا ہو۔ کیونکہ میں نے امرتسر کے جس مدرسہ میں اور جن
اساتذہ کی خدمت میں حفظ قرآن کیا تھا، حضرت قاری صاحب بھی اسی مدرسہ
اور انہی اساتذہ کے فیض یافتہ تھے۔ مگر جہاں تک یاد پڑتا ہے کہ باقاعدہ
تعارف اور ملاقات کا سب سے پہلا شرف اس وقت حاصل ہوا جب
میرے دل میں ۱۹۴۲ء میں باقاعدہ طور پر تحصیل تجوید کا شوق پیدا ہوا
چنانچہ اس مقصد کے لیے میں حضرت قاری صاحب کی خدمت حاضر ہوا
اور اپنا اشتیاق ظاہر کیا۔ حضرت قاری صاحب نے نہایت فراخ دلی اور
شفقت کے ساتھ مجھے اپنے سلسلہ میں داخل کر لیا۔ عصر کی نماز کے بعد
کا وقت مقرر ہوا اور جن دنوں اس وقت حاضر ہی ممکن نہ ہوتی تو مغرب
کے بعد مشق ہوتی۔ پوری تفصیل تو یاد نہیں۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ چند کورس
مشق کیے اور جناب قاری مقبول الہی صاحب کی معیت میں غالباً دو مرتبہ

مقدمتہ الجزری اور ایک بار علامہ سلیمان جبروری کا رسالہ تحفۃ الاطفال بھی
 البتہ صدر میں سنانے کا اتفاق نہیں ہوا تا آنکہ اپریل ۱۹۴۲ء میں میری
 کی مشغولیت ختم ہو گئیں اور میں امرتسر چلا گیا۔
 حسن سلوک اور ملاحظت

تعلیم کے زمانہ میں حضرت قاری صاحب کا پرتاؤ میرے ساتھ ہمیشہ
 جیسا کہ اپنے برابر والوں کے ساتھ ہوتا ہے حتیٰ کہ مخاطب کے وقت بھی اس
 احساس کو پیش نظر رکھا اور کبھی بھی مجھے اس طرح مخاطب نہیں کیا جس طرح
 شاگردوں کو کیا جاتا ہے۔ باوجودیکہ میں بلحاظ عمر بھی برابر والوں جیسے مخاطب
 مستحق نہ تھا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اپنے رخصت کے ایام میں مجھے بار
 اپنی جگہ پر کام کرنے کا سونپہ عنایت فرمایا اور پھر ان دنوں کا مشاہرہ بھی
 بہر حال میں اپریل ۱۹۳۳ء کو امرتسر چلا گیا اور حضرت قاری صاحب کی عقیدت
 و محبت ساتھ لے کر چلا گیا۔ پچنانچہ اس کے بعد بھی جب کبھی مجھے لاہور آنے
 اتفاق ہوتا تو حضرت قاری صاحب کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا اور قاری صاحب
 کو بھی مجھ سے کچھ ایسا انس ہو گیا تھا کہ میرے آنے سے بہت خوش ہوتے
 قرآن مجید سنانے کی فرماتے کرتے اور سن کر خوشی کا اظہار فرماتے۔ حتیٰ کہ
 ۱۹۴۵ء میں میں مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ سے وزارت عشرہ کی تکمیل کے
 واپس امرتسر پہنچا تو حضرت قاری صاحب نے مجھے اپنے ساتھ مسجد چینیائی
 میں بحیثیت استاذ تجوید رکھنے کا ارادہ ظاہر فرمایا بلکہ میرے قیام لکھنؤ کے
 میں بھی جب حضرت قاری صاحب جناب مولانا نور الہی صاحب عرف

ہوری کی معیت میں اپنے مدرسہ تجوید القرآن واقع مسجد چنیا نوالی کے لیے استاذ
 وید کی تلاش میں لکھنؤ لٹریٹ لے گئے تو وہ زمانہ کوئی ایسا نہ تھا کہ لکھنؤ کے
 اپنے ہائیکے شہر اور مدرسہ عالیہ فرقانیہ کے علمی اور ندید ماحول کو چھوڑ کر پنجاب
 لے آتے اس لیے قاری صاحب نے وہیں یہ خدمت بجد ہی سے لینے کا فیصلہ
 لیا۔ بالآخر میں جب فارغ ہو کر پہنچا تو قاری صاحب کی مساعی جیلہ کی بدلت
 ہی قعدہ ۱۳۶۴ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو بحیثیت استاذ تجوید مسجد
 چنیا نوالی میں میرا تقرر عمل میں آگیا اور میں نے کام شروع کر دیا۔ اگرچہ مجھے
 ہاں کچھ زیادہ مدت کام کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ کیونکہ جناب الحاج سیٹھی
 مدیر سٹ صاحب کی خواہش اور بااصرار فرمائش پر جس میں خود حضرت قاری
 صاحب کی رضا بھی شامل تھی مجھے فروری ۱۹۴۶ء میں گڑھی شاہو منتقل ہونا
 پڑا۔ لیکن تعلقات حضرت قاری صاحب کے ساتھ بھدا شہ جوں کے توں باقی
 رہے اور حضرت قاری صاحب بہ شہر شفقت فرماتے رہے اور غالباً یہ خیال
 آپ کے دل میں اس کے بعد بھی رہا کہ میں پھر مسجد چنیا نوالی میں اپنی سابق
 خدمت پر مامور ہو جاؤں۔ یہی وجہ تھی کہ میں جب اپریل ۱۹۴۷ء میں
 گڑھی شاہو سے منتقل ہو کر اسٹریٹ میں مسجد میں آیا تو کچھ مدت تک روزانہ
 مسجد چنیا نوالی میں آکر مشق کیا کرتا رہا۔ اور چونکہ اسٹریٹ میں مسجد سے ہر روز وہاں
 جانا میرے لیے کوئی آسان کام نہ تھا اس لیے یہ سلسلہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ اور
 یوں ہو کر اسٹریٹ میں مسجد میں خدمت کرنے لگا حتیٰ کہ جب اگست ۱۹۵۰ء
 میں مدرسہ تجوید القرآن واقع کوچہ کند پگڑاں کی تعلیمی بنیاد مسجد نور میں رکھی

گئی تو مدرسے کے حالات قدرے تسلی بخش ہوتے ہی حضرت قاری صاحب نے پھر مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دے دی۔ مگر اب مسجد اسٹریٹ بلوگرام کا مدرسہ اس سٹیج پر پہنچ چکا تھا کہ اسے چھوڑنا مناسب معلوم نہ ہوا۔ لیکر اگست ۱۹۵۱ء میں مجھے کچھ اپنی خواہش اور کچھ جناب الحاج سیٹھی محمد یوسف صاحب کی فرمائش کی بنا پر کراچی جانا پڑا۔ وہاں مجھ سے سیٹھی صاحب موصوف نے دریافت فرمایا کہ :-

”مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ میں کتنے اساتذہ کام کرتے تھے؟“
میں نے جواب دیا کہ :-

”میرے زمانہ میں تو چونکہ مدرسہ کا اسخطاط شروع ہو چکا تھا، اس لیے اس وقت اساتذہ کی تعداد صرف تیس تیس تک ہی رہ گئی تھی لیکن میں نے اپنے اساتذہ سے سنا ہے کہ مدرسہ کے شباب کے زمانہ میں اساتذہ کی تعداد سچپن ^{۵۵} تک پہنچ گئی تھی۔“
سیٹھی صاحب نے فرمایا کہ :-

”کراچی میں ایسا مدرسہ قائم کرو کہ ہمیں اس میں ۶۰ مدرسے رکھنے پڑ جائیں۔“

بہر حال کراچی میں قیام مدرسہ کی کوششیں ہوتی رہی مگر تقدیر الہی میں وہ وقت کراچی میں قیام مدرسہ کے لیے نہ پایا تھا۔ اس لیے کوئی مناسب سوزوں جگہ نہ مل سکی۔ اذہر حضرت قاری صاحب کے خطوط میرے پاس کراچی پہنچنے شروع ہو گئے کہ تم لاہور چلے آؤ اور مدرسہ تجوید القرآن کو ج

نزدیکوں میں شعبہ تجوید کی خدمت انجام دو۔ لیکن میں کراچی میں قیام مدرسہ
 خواہش کی وجہ سے لاہور واپس آنے کو پسند کرتا تھا۔ حضرت قاری عبدالمک
 صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان دنوں دارالعلوم اشرف آباد ٹنڈ واٹھار سندھ میں
 شعبہ تجوید وقرارت کے صدر مدرس کی حیثیت سے تشریف فرما تھے۔ میری
 خواہش یہ تھی کہ حضرت قاری صاحبؒ بھی کراچی ہی میں تشریف لے آئیں تو
 میں استفادہ بھی کروں لیکن ادھر حضرت قاری فضل کریم صاحب نے مجھے
 لاہور بلانے کے لیے اپنی کوشش کو آخری شکل اس طرح دی کہ جناب
 قاری مقبول الہی صاحب کو کراچی بھیج دیا۔ وہ وہاں ہر روز مجھ سے کئی
 بار ملاقات کرتے اور لاہور چلنے کی ترغیب دیتے۔ ادھر یہ ہوا کہ محترم
 جناب سلیم علی محمد یوسف صاحب پنجاب کے دورہ پر روانہ ہو گئے۔ چونکہ سلیم علی
 صاحب کراچی میں موجود نہ تھے اور مدرسہ کے لیے کوئی سوزوں جگہ بھی نہ مل سکی
 تھی اس لیے قاری مقبول الہی صاحب کی ترغیب نتیجہ خیر ثابت ہوئی اور میں
 نے ۱۸ جنوری ۱۹۵۲ء کو لاہور کے لیے کراچی چھوڑ دی۔ ۲۰ کو جب حضرت
 قاری فضل کریم صاحب سے مسجد نور واقع کوچہ کنڈیکر میں ملا تو بہت ہی
 مسرور ہوئے اور یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ اپنے کسی اعلیٰ مقصد میں کامیاب
 ہو گئے ہوں۔ الغرض ۲۳ جنوری کو مدرسہ تجوید القرآن کے شعبہ کا حضرت
 الاستاذ جناب قاری کریم بخش صاحب شاہ جہان پورنی ثم امرتسر ہی ثم لاہوری
 رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں باقاعدہ افتتاح ہوا اور اس ناچیز کو اس شعبے
 کا صدر مدرس مقرر کیا گیا۔ ۲۳ جنوری ۱۹۵۲ء سے ۱۶ مارچ ۱۹۵۲ء تک میں

اس شعبہ سے متعلق رہا۔ دس برس سے زیادہ عرصہ تک مجھے حضرت قاری
 فضل کریم صاحب کے ساتھ قرآن مجید کی ٹوٹی پھوٹی خدمت کرنے کا موقع
 ملا۔ اگر بات صرف میری ذات تک ہی محدود ہوتی تو شاید آتنا طویل عرصہ تک
 میں اس مسند پر فائز نہ رہ سکتا۔ کیونکہ سستی کاہلی اور نااہلی یہ چیزیں ایسی تھیں
 کہ ان کے ہوتے ہوئے، کوئی معیاری درس گاہ کسی مدرس کو گوارا نہیں کر سکتی
 خصوصاً حضرت قاری عبدالمالک صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لاہور میں تشریف لے
 آنے کے بعد تو قاریوں کی کمی بھی نہ رہی تھی۔ لیکن حضرت قاری صاحب کے اخلاق
 کریمانہ اور غایت درجہ کے شفقت و ملاحظت کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ ان سب
 کمزوریوں کے باوجود مجھے اتنی بڑی درس گاہ میں خدمت کا موقع ملتا رہا
 اور یہی نہیں۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے قمری حساب کے اعتبار سے تقریباً ساٹھے
 دس سال کے اس عرصہ میں قاری صاحب نے کبھی بھی میری کسی کمزوری
 کا ذکر نہیں فرمایا۔ یہ ایک حقیقت اور واقعہ ہے کہ اگر قاری صاحب کے دل
 میں مجھ سے شفقت اور خیر خواہی کا جذبہ موجود نہ ہوتا تو نہ معلوم وہ اس درس
 میں کتنے مدرس بدل ڈالتے اور مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اس وقت
 ٹوٹی پھوٹی خدمت کی توہین جو کچھ مجھے میسر ہے وہ حضرت قاری صاحب
 کی میرے ساتھ مودت و ملاحظت کا نتیجہ ہی ہے۔ باوجودیکہ مدرسہ کی طرف
 سے ترارت سے بوجہ پڑ جانے کا مطالبہ نہ تھا۔ لیکن اس پر بھی میں نے اپنے فائدہ
 اور اپنے مطالعہ کے پیش نظر اپنی طرف سے طمانا شروع کر دیا اور فن کی خاص
 کتاب نشاطیہ کوئی آسان کتاب میں ہی کہ میں معمولی سے مطالعہ کے بعد اسے

پڑھانے کے قابل ہو جاتا۔ اس لیے جب میں نے پہلی مرتبہ وہ کتاب مدرسہ
تجوید القرآن میں پڑھائی تو یاد پڑتا ہے کہ مدرسہ کے اوقات میں حضرت
قاری فتح محمد صاحب کی لکھی ہوئی طویل شرح تین تین بار سنتا تھا۔ جس پر
ایک ایک گھنٹہ اور کبھی کبھی ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ بھی صرف ہو جاتا تھا۔ لیکن
قاری صاحب نے برا تو کیا منایا ہوگا بلکہ وہ اس سے خوش ہی ہوتے تھے۔
اور باوجودیکہ مدرسہ کے بعض ممتاز اراکین کی رائے یہ تھی کہ اس مدرسہ
میں قرار سے سب سے زیادہ تعلیم نہیں ہونی چاہیے اور جنہیں روایتِ حفصہ کے بعد
قرارت کی مزید تعلیم حاصل کرنا ہو۔ انہیں حضرت قاری عبد الممالک صاحب
رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جانا چاہیے۔ یہ رائے اس اعتبار سے تو نہایت
درست اور بالکل صحیح تھی کہ اہل ترین شخصیت کے ہوتے ہوئے اور پھر وہ بھی
اسی شہر میں۔ نا اہلوں سے علم حاصل نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن حضرت قاری
صاحب کے پیش نظر یہ تھا کہ اگر چھوٹوں سے بڑوں کی موجودگی میں یہ کام
نہ لیا گیا تو پھر بعد میں ان پر کون اعتماد کرے گا اور یہ سلسلہ جاری کیسے رہ
سکے گا۔

العرض مجھے حضرت قاری عبد الممالک صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حیات
میں کئی بار مدرسہ تجوید القرآن کے قیام کے زمانہ میں "شفا طبیہ" بلکہ "درہ" اور
طیبہ بھی پڑھانے کا موقع ملا اور یہ سب کچھ حضرت قاری صاحب کی
فراخ دلی اور بلند حوصلگی ہی کا نتیجہ تھا۔ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعہ۔
جیسا کہ میں مضمون کے شروع میں لکھ چکا ہوں کہ مجھے جب شروع

شروع میں باقاعدہ طور پر علم تجوید کی تحصیل کا شوق پیدا ہوا تو میں نے سب سے پہلے حضرت قاری صاحب ہی کو اپنا استاد بنایا لیکن اس کے باوجود دس ساڑھے دس سال تدریسی مدت میں انہوں نے ایک مرتبہ بھی یہ بات ظاہر نہیں کی اور اس تعلق کا کبھی ذکر تک نہیں کیا۔ بلکہ ہمیشہ وہ میرے کام کی حوصلہ افزائی ہی فرماتے رہے۔ اور برابر والوں کا ناسلوک کرتے رہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اگر مدرسہ کے بارے میں کوئی مشورہ کرنا ہوتا، تو اکثر و بیشتر خود میرے کمرے ہی میں تشریف لاتے اور وہیں مشورہ فرماتے طلباء کے ساتھ ملاحظت اور حسن سلوک

اللہ تعالیٰ نے حضرت قاری صاحب کو بعض خصوصیات کچھ ایسی عطا فرمائی تھیں جن سے اس دور کے بہت سے اساتذہ عموماً خالی نظر آتے ہیں۔ انہیں میں سے طلباء کے ساتھ آپ کا وہ برتاؤ بھی ہے جس نے طلباء کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا اور جس کی وجہ سے مدرسہ تجوید القرآن جلد ہی حفظ و قرارت کا ایک مرکز بن گیا تھا اور طلباء یہاں آکر علم حاصل کرنے میں راحت محسوس کرتے تھے۔ عموماً طلباء کے ساتھ خذہ پیشانی سے پیش آتے۔ ان کی آرام و راحت کا ہر ممکن خیال رکھتے تھے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں سے اغماض فرماتے۔ اگر کسی وجہ سے کسی طالب علم سے کبھی ناراض ہو جاتے تو عرصہ کی کیفیت جلد ہی زائل ہو جاتی۔ بلکہ بعض دفعہ تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ خود اس طالب علم کو بلا کر مشفقانہ لہجے میں نصیحت فرماتے، اور اس طرح گویا اس طالب علم سے خود ہی صلح کر لیتے۔ طلباء سے کچھ کھانے

نے اور ان کی چیزوں پر نظر رکھنے کی بجائے حضرت قاری صاحب انہیں اپنے
اس سے کھلاتے اور حیثیت کے مطابق ان پر داد دہش کرنے کے عادی
تھے۔ آپ جہاں مسافر اور نادار طلباء کی تعلیم اور ان کی ضروریات کے تکفل
کا خیال رکھتے تھے وہاں شہری اور مقامی طلباء کو بھی پڑھانے کا شوق رکھتے
تھے اور مسافر طلباء کی طرح مقامی اور شہری بچے بھی ان کے ساتھ ولی عقیدت
رکھتے تھے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ جب مدرسہ تجوید القرآن کی موجودہ عمارت کا ارادہ
لیا گیا اور غالباً ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء مطابق ۱۲ ربیع الاول ۱۳۷۶ھ کو اس کی
بنیاد رکھی گئی تو صرف چھ ماہ کی قلیل مدت میں ایک مختصر سی مسجد، چودہ کمروں
ان کے برآمدوں اور دوسرے متعلقات پر مشتمل ایک نہایت منضبوط عمارت
تیار ہو گئی۔ حضرت قاری صاحب کی طبیعت باوجود اعتقاد و عمل کی سختگی
کے ملن سارا اور ہمہ گیر واقع ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مدرسہ تجوید القرآن
کی بنیاد رکھنے وقت آپ نے مسلمانوں کے مکاتب ثلاثہ یعنی دیوبندی،
اہل حدیث اور بریلوی تینوں مکاتب فکر کے متفہم اور ممتاز ترین علماء
کو اس تقریب میں فرمایا۔ چنانچہ دیوبندی مکتب فکر کی طرف سے
رأس الاولیاء حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری کو۔ اہل حدیث کی
طرف سے حضرت مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی کو اور بریلوی مکتب فکر
کی طرف سے حضرت مولانا ابوالحسنات خطیب جامع مسجد وزیر خاں کو
شرکت کی دعوت دی اور یہ تینوں حضرات تشریف بھی لائے مگر ہوا یہ کہ

عین بنیاد رکھنے کے وقت ان تینوں نے شیخ القرار امام المجددین حضرت
مولانا قاری عبدالملک صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا نمائندہ چن لیا اور اس
طرح بنیاد کی پہلی اینٹ حضرت قاری صاحب نے اپنے مبارک ہاتھوں سے
رکھی اور ان بزرگوں کا یہ اقدام ایک اعلیٰ فراست کا حامل تھا کہ یہ مدرسہ جس
علم کی درسگاہ بننے والا ہے اسی علم کے صدر الصدور کے ہاتھوں سے بن
رکھوانی۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

ربلیگان کی پرورش

من جملہ حضرت قاری صاحب کے محاسن کے ایک یہ بھی ہے کہ آپ نے
اپنی ہردو ربلیگان کی اس حسن سلوک اور مدارات کے ساتھ پرورش فرمائی
کہ اس محبت اور شفقت کے ساتھ اپنی حقیقی بچیوں کی پرورش بھی وہی کر
سکتا ہے جس کو آخرت میں اللہ تعالیٰ سے کچھ بلکہ بہت کچھ لینے کا خیال ہو۔
نہ جاننے والا یہ کبھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ قاری صاحب کی ربلیہ ہیں۔ عمل کے
علاوہ ان کا اعتقاد بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ چنانچہ فرمایا کرتے تھے کہ :-
”مجھے جو کچھ مل رہا ہے۔ ان یتیموں ہی کی وجہ سے مل رہا ہے“

اور مجھے تو یوں خیال ہوتا ہے کہ حضرت قاری صاحب اس خدمت کے
بدولت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پاک ارشاد کے مستحق بن گئے
تھے :-

مَنْ عَالَ جَارَ يَتِيمٍ حَتَّىٰ تَبْلُغَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنَا
وَهُوَ هَكَذَا مِنْ أُمَّةٍ مَابِعَةٍ.

یعنی جس شخص نے دو بچوں کی پرورش کی تا آنکہ وہ سن بلوغ کو پہنچ گئیں تو میں اور وہ قیامت کے دن اس طرح اکٹھے آئیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اکٹھے آنے کی کیفیت اپنی مبارک انگلیاں ملا کر سمجھائی۔

باوجودیکہ آپ کی بڑی صاحبزادی تقریباً وائٹ المرصن تھی اور اس کے علاوہ بعض دوسرے مرضات سے بھی اس بیماری کو دوچار ہونا پڑا۔ لیکن علاج معالجہ اور دوسرے خدمات کے وقت یہ کبھی ظاہر نہ ہوتا تھا کہ یہ آپ کی ربیبہ ہے۔

ابن سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

طلباء پر کٹر طول

باوجودیکہ حضرت قاری صاحبؒ ظاہری بصارت سے موصوف نہیں تھے۔ لیکن پھر بھی طالب علموں پر ان کا کچھ ایسا رعب سا چھایا رہتا تھا کہ کیا مجال کہ حضرت قاری صاحبؒ درس گاہ میں موجود ہوں اور کوئی طالب علم دوسرے سے آواز سے بات بھی کر لے۔ بلکہ اکثر ایسا دیکھا گیا کہ طالب علم شور کر رہے ہیں اور حضرت قاری صاحبؒ کو دور سے آتے دیکھ کر ان پر کچھ ایسا سناٹا طاری ہو گیا کہ گویا ان کے منہ میں زبان ہی نہیں اور ان کی جماعت پر کچھ ایسی سنجیدگی اور تمنائت چھا گئی۔ گویا کہ وہ بچے ہی نہیں ہیں۔ مسجد چینیانوالی اور مدرسہ تجوید القرآن کے ابتدائی دور میں تو یہ کیفیت بہت ہی نمایاں تھی، مگر بعد جب تلامذہ کا حلقہ وسیع ہو گیا اور عمر نئے بھی بڑھاپے میں قدم رکھ دیا تو

یہ کیفیت کسی حد تک ملاحظت اور شفقت کے ساتھ بدل گئی بلکہ اب تو بعض بڑے طلباء کے ساتھ کچھ بے تکلفی بھی فرمایا کرتے تھے مگر اس حد تک نہیں اس سے تعلیم و انتظام کا کام متاثر ہو۔

حسن تدریس

ایک بہت ہی اعلیٰ اور مبارک وصف اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے حضرت قاری صاحب کو یہ عطا فرمایا تھا کہ ان کی خواہش ہوتی تھی کہ میرے شاگرد بالکل اسی طرح کے بن جائیں اور بالکل اسی طرح پڑھنے لگیں جس طرح کہ میں پڑھتا ہوں۔ اس لیے وہ پڑھاتے وقت صحت لفظی اور عملی تجوید کا پورا خیال فرماتے اور طلباء کو عملاً تجوید کے موافق پڑھنے کی بڑی سمجھتی کے ہدایت فرماتے اور ایک ایک لفظ پر نگاہ رکھتے اور روک ٹوک فرماتے جو ان کے زمانہ میں تو یہ صفت بہت ہی اباگر تھی۔ میں بغیر کسی تصنع اور بناوٹ کے عرض کرتا ہوں کہ حضرت قاری صاحب کے اس وقت کے شاگرد آج کل بہت سے عام قاریوں سے بھی اچھا پڑھتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں جب قاری محمد شاہ صاحب لکھنوی لاہور تشریف لائے اور احقر سے مسیحا چینیا نوالی میں ان کی ملاقات ہوئی تو حضرت قاری صاحب کے شاگردوں سے سن کر بہت ہی مسرور ہوئے اور حسن تدریس پر اپنا تاثر ان الفاظ میں فرمایا کہ :-

”صحت لفظی کا اس قدر خیال تو ہمارے مدرسہ عالیہ فرقاہیہ کے اساتذہ بھی نہیں رکھتے۔“

بزرگوں اور اساتذہ کا احترام

حضرت قاری صاحب کے اندر جہاں اور بہت سی خوبیاں تھیں وہاں ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ آپ اپنے بزرگوں اور اساتذہ کا حد درجہ احترام فرماتے تھے۔ حضرت قاری کریم بخش صاحب بلحاظ عمر حضرت قاری صاحب سے کوئی اتنے زیادہ بڑے نہیں تھے لیکن بارہا ایسا دیکھا گیا کہ حضرت قاری کریم بخش صاحب آپ کو مدرسہ تجوید القرآن میں شاگردوں کے سامنے ڈانٹ رہے ہیں اور وہ تسلیم و رضا کا پیکر بنے سامنے اس طرح کھڑے ہیں جیسے کوئی چھوٹا بچہ ہو اور اُت تک نہیں کرتے حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ لاہور میں حضرت قاری صاحب کے تلامذہ اور متوسلین کا حلقہ غالباً استاد سے بھی وسیع ہو گیا تھا شاید اس تواضع ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت قاری صاحب کے شاگردوں کے دلوں میں اور نہ صرف شاگردوں کے بلکہ مدرسہ کے اراکین اور ان کے مالی معاونین کے دلوں تک میں بھی ان کی عزت پیدا فرمادی تھی اور وہ آپ کا اس طرح احترام کرتے تھے جس طرح چھوٹے اپنے بڑوں کا کیا کرتے ہیں۔

من تواضع لله رفعتہ الله

مدرسہ کی ترقی کا خیال

حضرت قاری صاحب کو اس کا بہت خیال رہتا تھا کہ مدرسہ جس معیار پر پہنچ چکا ہے۔ اس میں تنزل نہ ہونے پائے بلکہ ہر لحاظ ترقی کی طرف ہی سے گامزن رہے۔ یہی دہر ہے کہ احقر نے جب شعبان ۱۳۸۱ھ میں مدرسہ تجوید القرآن کے چھوڑنے اور ایک الگ مدرسہ بنانے کا فیصلہ کیا اور حضرت

قاری صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ کو بہت تشویش ہوئی اور مجھے اس خیال کے ترک کر دینے اور اپنی خدمات مدرسہ تجوید القرآن ہی کے ساتھ وابستہ رکھنے کی بہت ترغیب دی اور دوسروں سے بھی کہلوا یا۔ لیکن حالات کچھ ایسے تھے کہ میرا اب مدرسہ کے ساتھ منسلک رہنا مشکل تھا اور مشکلات تھیں بھی کچھ اس قسم کی کہ ان کا تدارک حضرت قاری صاحب کے امکان میں نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود آپ کا اصرار یہی تھا کہ جیسے کیسے بھی ہو۔ میں مدرسہ تجوید القرآن ہی کے ساتھ منسلک رہوں۔ حتیٰ کہ میرے ماڈل ٹاؤن چلے آنے کے بعد بھی ان کا یہی اصرار رہا کہ میں واپس چلا آؤں اور آپ کی اس خواہش اور بااصرار فرمائش کی بنا پر میں نے بھی کئی بار واپس چلے جانے کا ارادہ کر لیا لیکن قدرت کو چونکہ ماڈل ٹاؤن کے مدرسہ کا قیام منظور تھا اس لیے میں حضرت قاری صاحب کی خواہش اور اپنے ارادہ کے باوجود واپس نہ جاسکا۔ مگر حضرت قاری صاحب کو باوجودیکہ اس کا حد درجہ افسوس تھا لیکن اس پر بھی وہ مجھ سے ناراض نہیں ہوئے۔ چنانچہ گاہے بگاہے وہ ماڈل ٹاؤن تشریف بھی لاتے رہے۔ بلکہ دارالقرار کے سالانہ امتحان کے لیے بھی آپ ہی تشریف لاتے رہے تھے کہ بیماری کے پہلے سال بھی باوجود حد درجہ کی نقاہت کے میری خواہش اور درخواست پر آپ امتحان کے لیے تشریف لائے اور اس وقت آپ پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ خوشی کا اظہار کچھ زیادہ ہی فرمایا۔ الفاظ تو یاد نہیں رہے۔ البتہ مفہوم یہ تھا کہ :-

”اللہ کا شکر ہے کہ اس علاقہ میں بھی تجوید کا مرکز قائم ہو گیا ہے۔“

چنانچہ اس روز مجھے بھی اطمینان ہوا اور میں نے سمجھا کہ میرے ماڈل ٹاؤن
 چلے آنے کی وجہ سے آپ کو جو افسوس تھا وہ بجز اللہ اب جاتا رہے۔
 قرآن مجید سننے کا شوق

حضرت تاری صاحب کو قرآن مجید سننے کا بے حد شوق تھا۔ خصوصاً جب
 سے آپ کو قرار مصر کی قاہرہ ریڈیو سے مسلسل تلاوتوں کا علم ہوا۔ اس وقت
 سے تو اس شوق نے عشق کی کیفیت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ شام کے چار بجے
 سے رات کے گیارہ بجے تک کے اوقات میں بااستثنا اوقات نماز کے شاید
 ہی کوئی تلاوت ایسی ہوتی ہو جسے آپ سن نہ پاتے ہوں ورنہ اس وقفہ میں
 قاہرہ سے جن جن اوقات میں تلاوت نشر ہوتی تھی نہ صرف وہ اوقات بلکہ
 ریڈیو کے کس میں ان تلاوتوں کے سننے کی جگہیں بھی آپ کو کچھ اس طرح اذہر
 ہو گئیں تھیں جس طرح لوگوں کو اپنے گلی کوچہ اور مکان کا محل وقوع یاد ہوتا
 ہے۔ ادھر کسی تلاوت کا وقت ہوا، ادھر ٹن دیا۔ بس فوراً تلاوت کی آواز
 آئی شروع ہو گئی۔ اولاً تو ریڈیو کے دوسرے پروگراموں سے آپ کو کوئی
 دل چسپی ہی نہیں تھی۔ لیکن اگر کبھی کبھار خبروں کی یا کسی دوسرے اور مفید
 پروگرام کی سماعت فرماتے بھی تو یہ گوارا نہ ہوتا کہ قاہرہ ریڈیو سے تو تلاوت
 ہو رہی ہو اور آپ کسی دوسرے پروگرام کے سننے میں مشغول ہوں۔ اس
 لیے تلاوت کا وقت شروع ہوتے ہی اس پروگرام کو چھوڑ کر تلاوت کے
 اسٹیشن کا ٹن دیا دیتے۔ اور ہمہ تن گوش ہو کر قرآن مجید سننے میں
 مشغول ہو جاتے۔ رحمة اللہ علیہ

خدمتِ دین کا جذبہ

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے جہاں حضرت قاری صاحب سے جوانی کی ابتداء سے عمر کے آخری حصہ تک اپنے کلام مجید کی نیابت مٹھوس اور وسیع خدمت لی۔ وہاں آپ کے دل میں یہ خواہش بھی پیدا فرمادی کہ میرا کچھ بھی اپنی زندگی دین ہی کی خدمت میں صرف کرے۔ پچنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر پہلے اس کو قرآن مجید حفظ کرایا اور پھر علوم عربیہ کی تحصیل میں مشغول کر دیا۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ لاہور میں اس کے تعلیم کے مکمل ہونے میں کچھ دشواریاں پیش آرہی ہیں تو باوجودیکہ ایک ہی صاحبزادہ تھا مگر اس پر بھی تحصیل علم کے لیے دوسرے شہروں میں بھیج دیا لیکن جب وہ بعض وجوہ کی بنا پر وہاں نہ ٹھہر سکا تو واپس لاہور بلا لیا اور مدرسہ تجوید القرآن میں روایتِ حفص اور عربی کی ابتدائی تعلیم دلائی تاکہ اگر یہ پورا عالم نہ بن سکے تو قرآن کے الفاظ کی خدمت کرنے کے قابل تو ہو ہی جائے۔ اور یہ جذبہ صرف اپنے ہی بچے تک محدود نہیں تھا بلکہ آپ اپنے بعض دوسرے ہونہار شاگردوں کے بارے میں بھی اس قسم کی خواہش رکھتے تھے۔ پچنانچہ آپ نے ان بچوں کے والدین سے یہ وعدہ بھی لے لیا اور پھر اس لائن پر ڈال بھی دیا اور اس سے زیادہ آپ کے بس میں اور تھا بھی کچھ نہیں۔ جزا لا اللہ احسن الجزاء فی البرحاء و فی یوم الجزاء۔

بیماری اور وفات

چونکہ اختصارِ پیش نظر ہے اور میری معلومات کی حد تک چیدہ چیدہ

حالات تقریباً بیان بھی ہو چکے ہیں۔ اس لیے اب میں زندگی کے آخری حصہ کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں۔ اگرچہ زندگی کے اس شعبہ سے متعلق میری نسبت اہل خانہ اور مدرسہ تجوید القرآن کے مہتمم جناب حافظ قاری محمد رفیع صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ زیادہ معلومات رکھتے ہیں کیونکہ میں ان دنوں ماڈل ٹاؤن میں تھا کبھی کبھار ہی حاضری کا شرف نصیب ہوتا تھا۔ آپ تقریباً ساڑھے تین برس بیمار رہے۔ غالباً ذی القعدہ ۸۶ھ میں بیمار ہوئے اور ربیع الثانی ۹۰ھ میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اس اکتالیس ماہ کے طویل عرصہ میں گویا ایک بار اس قسم کا افاقہ بھی ہوا جیسے بیماری چلی گئی ہو۔ اور ان ایام میں آپ نے تدریس کا کچھ تھوڑا بہت کام بھی کیا۔ لیکن چند ہی یوم کے بعد بیماری پھر عود کر آئی اور صحت عارضی ثابت ہوئی۔ اس طویل مدت میں اللہ ہی کو معلوم ہے کہ مریض کو کتنی اور کس کس قسم کی تکلیف رہی ہوگی۔ لیکن دیکھنے والوں کی شہادت یہ ہوتی تھی کہ قاری صاحبؒ کی طبیعت تو اگرچہ حد درجہ کمزور ہے لیکن چہرے پر انبساط و طمانیت کے آثار نمایاں ہیں۔ چنانچہ میں نے جب بھی جناب قاری محمد رفیع صاحب سے آپ کی ست کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کمزوری اور بیماری کے ساتھ اس انبساط اور چہرے کی اس رونق کا ذکر بھی ہمیشہ کیا جس کا مطلب یہی ہے کہ باوجود تکلیف کے دل حمد و شکر اور تسلیم و رضا کی کیفیت سے معمور تھا ورنہ دل اگر مطمئن نہ ہو اور وہ قلب سلیم کا مصداق نہ بن گیا ہو تو چہرے پر انبساط کے آثار نمایاں ہو ہی نہیں سکتے۔

چنانچہ انتقال کے کوئی تین ماہ پہلے مجھے جب آخری بار مدرسہ تجوید القرآن کے مہتمم اور سلطان فونڈری کے حافظ محمد اشرف صاحب کی معیت میں حاضری کا موقع ملا تو اس وقت بھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آپ کا دل مطمئن ہے چنانچہ مجھ سے قرآن مجید سننے کی فرمائش کی۔ میں نے سورہ کہف کی آخری تین آیات تدویر میں مختصر آواز کے ساتھ پڑھ کر سنائیں۔ سن کر خوش ہوئے اور کچھ باتیں بھی کہیں جو مدرسہ تجوید القرآن اور مدرسہ دارالقرآن کی تعلیمی کیفیت امتحانات کے نتائج اور میری صحت سے متعلق محققین مگر چونکہ زبان میں لکنت بہت تھی۔ میں نہ سمجھ سکا۔ اس لیے حافظ محمد رفیع صاحب نے آپ کا مدعا بیان کیا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سوائے تین سال بیمار رہنے کے بعد بھی قرآن کی اشاعت اور قرآنی مدرسوں کی ترقی جیسے دینی امور سے دل چسپی باقی تھی۔ ورنہ اتنی لمبی بیماری میں تو آدمی اللہ رحم کرے اپنے بیوی بچوں بلکہ خود اپنے آپ سے بھی تنگ آجاتا ہے۔ ایسی حالت میں مدرسوں کی تعلیمی کیفیت اور نتائج کے بارے میں استفسارات کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

وفات

بہر حال یہ میری آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد حالات تو معلوم ہوتے رہے لیکن حاضری کا اتفاق نہ ہو سکا تا آنکہ ۲۳ جون کو بعد نماز ظہر مجھے قاری سعید احمد صاحب مدرس مدرسہ تجوید القرآن نے ماڈل ٹاؤن آکر اس نسخہ کا اطلاع دی کہ حضرت قاری صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ سنتے ہی محوڑی دیر کے لیے ایک دم سکتہ سا طاری ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ

راجحون۔ پھر دریافت کرنے پر بتایا کہ جنازہ بعد نماز مغرب ہو گا اور جیاموسے کے قبرستان ہی میں دفن کیے جائیں گے۔ جنازہ میں شرکت کی توفیق نصیب ہوئی۔ نماز جنازہ بوجوب وصیت مدرسہ تجوید القرآن کے مہتمم جناب حافظ قاری محمد رفیع صاحب نے پڑھائی باوجودیکہ موسم سخت گرمی کا تھا اور جیاموسے کی آبادی بھی ایک دیہاتی قسم کی آبادی ہے اور وقت بھی رات کا تھا لیکن اس پر بھی قرآن کے اس سچے خادم کی نماز جنازہ میں شرکت کرنے کے لیے نہ صرف لاہور کے دور دراز محلوں کے بلکہ بعض دوسرے شہروں سے بھی قرآن سے محبت رکھنے والے حضرات تشریف لائے۔ شہینہ و تکفین کے بعد جب آپ کا جنازہ زیارت کے لیے مکان سے باہر رکھا گیا تو دیکھنے والوں کا تاثر عجیب تھا۔ چنانچہ میں نے بعض لوگوں کو یہاں تک کہتے سنا کہ خدمت قبول ہو گئی اور دیکھنے والوں کی شہادت کے بوجوب یوں محسوس ہو رہا تھا گویا آپ مسکرا رہے ہیں۔ اور چہرے پر اطمینان و کامیابی کے آثار نمایاں ہوں۔ نہ معلوم اس وقت کتنوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا ہو گا کہ کاش کہ یہ جنازہ میرا ہوتا۔ الغرض قرآن کا یہ سچا خادم اس دنیا سے کامیاب و کامران گیا اور فضل کریم پر کریم کا فضل ہو گیا۔

واخرو دعونا ان الحمد لله رب العالمین

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ
اجمعین۔ آمین ثم آمین برحمتک یا ارحم الراحمین

قاری صاحب کے چند تلامذہ

- حافظ قاری مقبول الہی صاحب حال مقیم امریکہ
- حافظ قاری زید مقبول ایم بی بی ایس (فائل) کے۔ اسی میڈیکل کالج لاہور
- سلیم تابانی ریڈیو پاکستان لاہور
- مولانا سید ابوبکر غزالی صدر شعبہ اسلامیات انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور
- شجاع الدین ٹیسٹ کریٹر معہد القرآن مانسہرہ
- حضرت مولانا قاضی عبدالرحیمن چن پیر صاحب نے بھی استفادہ کیا۔
- حافظ قاری محمد امیر صاحب نے بھی استفادہ کیا۔
- حافظ قاری آفتاب احمد چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ (گلاسکو یونیورسٹی) یو۔ ایس اینڈ
- گلبرگ لاہور
- ڈاکٹر حافظ قاری محمد شفیق ایم بی بی ایس (سعودی عرب)
- ڈاکٹر حافظ قاری محمد یونس ایم بی بی ایس (امریکہ)
- حافظ قاری غلام مرتضیٰ صاحب ایم ایس سی (پنجاب) پی ایچ ڈی (لنڈن)
- اسلام آباد
- حافظ قاری محمد حفیظ صاحب۔ حافظ جی لوہے والے بیڈن روڈ لاہور
- حافظ قاری محمد مشتاق صاحب۔ اعظم کلائنٹ مارکیٹ لاہور

- حافظ قاری حامد حسن
- حافظ قاری نذیر عطار
- مولانا حافظ احسان الہی ظہیر ایم اے ایم او بی ایل فاضل مدرسہ یونیورسٹی
- قاری شمس الدین صاحب ہزاروی
- حافظ قاری عبد المجید صاحب ایبٹ آبادی مدرس حال (سعودی عرب)
- حافظ قاری خلیل الرحمن صاحب منظر آبادی مدرس حال (سعودی عرب)
- حافظ قاری مسافر جان صاحب مدرس مدرسہ تجوید القرآن موتی بازار لاہور
- حافظ قاری غلام محمد کیمیل پوری مدرس (گجرات)
- حافظ قاری محمد سعید صاحب مدرس مدرسہ تجوید القرآن موتی بازار لاہور
- حافظ قاری فیوض الرحمن ایم اے صدر شعبہ اسلامیات گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد
- حافظ قاری عبد الحمید صاحب مدرس مدرسہ تجوید القرآن حویلیاں
- حافظ قاری عبد المجید بن حاجی محمد سعید صاحب انارکلی لاہور
- حافظ قاری اشتقاق الہی صاحب لاہور
- حافظ قاری محمد اکبر شاہ منظر آبادی مدرس (سعودی عرب)
- حافظ قاری قاضی بشیر احمد صاحب مدرس (سعودی عرب)
- حافظ قاری حاجی محمد نذیر صاحب مدرس مکی مسجد لاہور
- حافظ قاری محمد اشرف صاحب سلطان فونڈری بادامی باغ لاہور
- حافظ قاری محمد افضل صاحب چوک داگراں لاہور
- حافظ قاری محمد تنویر صاحب دواماد حضرت قاری صاحب (عظیم کلا متھ مارکیٹ لاہور)

○ حافظ قاری محمد عمر صاحب ہزاروی صدر مدرس مدرسہ انوار الاسلام

کھیال ایسٹ آباد

○ حافظ قاری عبید اللہ صاحب سواتی

○ حافظ قاری شمشاد صاحب رائیس ڈیلر مرید کے منڈھی

○ حافظ قاری محمد اسلم بھٹی بٹن والے

○ حافظ قاری محمد یوسف صاحب جیاموٹے

○ حافظ قاری شیخ افضل صاحب

○ حافظ قاری محمد اقبال صاحب صدر شعبہ تجوید والقرارت راجہ بازار راولپنڈی

○ قاری عبدالرشید صاحب مکی مسلم مسجد لاہور

○ حافظ قاری محمد عبدالغنی صاحب لاہوری

سوانح

حضرت قاری فیض کریم صاحب



مرتبہ

حافظ قاری فیوض الرحمن ایم اے اہلیا زمی (عربی، اسلامیات، اردو، فارسی)
صدر شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ کالج ایسٹ آباد ضلع ہزارہ صوبہ سرحد

AL - MASHRAQ PUBLISHERS LAHORE.